ماہنامہ
بیداری
حیدر آباد

مدیر
☆☆☆
حافظ محمد موسیٰ بھٹو

زیر اہتمام
☆☆☆
سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ
400-بی لطیف آباد4-حیدر آباد
E-MAIL
m.moosabhutto@gmail.com
www.bedarimillat.com

موبائل نمبر:
03463216078

جلد انیسواں○ اگست-ستمبر2024
قیمت:25روپے،سالانہ:300روپے

ہمارے کچھ اہم معاملات	محمد موسیٰ بھٹو	۲
احادیث نبوی کی روشنی میں تجدد پسندی سے الحاد تک (ایک واقعاتی قصہ)	ڈاکٹر حبیب احمد خان	۱۵
غلامانہ ذہنیت کا ورثہ ٹوٹنے نہ پائے!	سید ابوالحسن علی ندوی	۲۰
مغرب کے علمی مراکز کی آواز مدرسہ ڈسکورسز (علمائے کرام کی توجہ کے لئے)	ڈاکٹر مفتی یاسر ندیم الوطد ی	۲۳
خیالی قوت کی اہمیت اور زندگی کو بنانے اور بگاڑنے میں اس کا کردار	محمد موسیٰ بھٹو	۲۷
خیالات میں پاکیزگی کیسے پیدا ہو ہمہ فرد کو درپیش بحران کا تجزیہ	محمد موسیٰ بھٹو	۳۱
زوال وانتشارِ تہذیب	مختار مسعود	۳۴
اولڈ ہومز میں آنسو بہاتی مائیں	محمد زکریا نعمانی	۳۸
بھگت سنگھ سے محمد شکیل تک کا سفر فلمی ستاروں سے ملنے کے لئے جانے والا اسلام کے نور سے منور ہو گیا	محمد عامل عثمانی	۴۳
باطنی بصیرت اور داخلی توانائی کا کام اور اس کی فیصلہ کن اہمیت	محمد موسیٰ بھٹو	۴۵
اعتدال، امتِ مسلمہ کی خصوصیت	مولانا عبدالمتین	۴۸
اسلامی نظامِ معیشت کی دو اخلاقی بنیادیں	ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی	۵۵
مذہبی گروہ بندی سے بچاؤ کی ضرورت	حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری	۵۹
مولانا جلال الدین رومی رحمہ اللہ علیہ	مولانا محمد زبیر فضل انتخاب: مولانا عبدالستار	۶۲
بندہ مؤمن کی طرز زندگی	مولانا محمد یوسف	۷۰

پبلشر: محمد موسیٰ بھٹو نے یادگار پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ 400بی لطیف آباد-4-حیدر آباد سے شائع کیا

اور اس کے اصول وآداب	ترتیب وتشریح محمد موسیٰ بھٹو	

محمد موسیٰ بھٹو

پہلی قسط

ہمارے کچھ اہم معاملات

احادیث نبوی کی روشنی میں

اللہ کے رسول اللہ ﷺ کی احادیث ہماری زندگی کے سارے معاملات میں رہنمائی کا بھی ذریعہ ہیں تو ساتھ ساتھ ایمان ویقین میں اضافے اور نور نبوت کے حصول کا بھی۔ اگر ان احادیث کو پورے دھیان، توجہ اور غور وفکر پڑھا جائے یا سنا جائے اور اس سلسلے کو مستقلاً جاری رکھا جائے تو اس سے ہماری زندگیوں میں پاکیزگی اور تابناکی پیدا ہو سکتی ہے، آیئے، اللہ کے رسول ﷺ کی احادیث کو دل کی گہرائیوں سے سنیں اور اپنے ایمان ویقین میں اضافہ کریں، احادیث سے رہنمائی کا یہ سلسلہ ان شاءاللہ کافی دنوں تک چلتا رہے گا۔

مال کی محبت کے اثرات

سونے کی وادیوں سے بھی پیٹ کا نہ بھرنا

فرمایا: اگر ابن آدم کو سونے سے بھری ہوئی وادی دے دی جائے تو وہ دوسری وادی کا خواہشمند ہوگا، اگر دوسری وادی دی جائے تو تیسری کا طلب ہوگا، ابن آدم کے پیٹ کو مٹی کے علاوہ اور کوئی نہیں بھر سکتی اور اللہ تعالیٰ تو اس کی توبہ قبول کرتا ہے جو (صدق دل سے) اس کی طرف رجوع کرے (صحیح بخاری)

دنیا کی ہوس ایسی چیز ہے کہ اس سے پیٹ بھرنے والا ہی نہیں ہے، ایک فرد کو اگر ساری دنیا کی دولت دی جائے تو بھی اس کی ہوس ختم نہیں ہوگی، دنیا کی خاصیت ہی یہ ہے کہ وہ فرد کو اپنی طرف کھینچ کر اس میں محو رکھتی ہے، اس حدیث شریف میں دنیا کی اس خصوصیت کی بہت بہتر طور پر نشاندہی فرمائی گئی ہے۔

جو شخص صدق دل سے دنیا سے بے نیاز ہو کر اللہ کی طرف رجوع ہو، اللہ کی کو اپنا مقصود بنالے تو ایسے فرد کی اللہ توبہ قبول فرماتا ہے اور اسے اپنا بنالیتا ہے۔

جب مال آتا ہے اور زیادہ آنے لگتا ہے اور مالداری مستحکم ہونے لگتی ہے تو اس سے مسرفانہ زندگی کی دوڑ شروع ہونے لگتی ہے، اس سے ایک طرح سے مالدارانہ نوعیت کی تہذیب وجود میں آنے لگتی ہے، جس سے مادی سرگرمیوں کو عروج حاصل ہوتا ہے، اگرچہ یہ مالدارانہ تہذیب مادہ پرست تہذیب نہیں ہوتی، اس میں عقائد اور مذہبی رنگ بھی موجود ہوتا ہے، لیکن اس میں دین ومذہب کی گرفت ڈھیلی ہوتی ہے، ملک میں مالدار طبقات کے زیر سرپرستی ایسا نظام وجود میں آتا ہے، جس میں اسلام اور اسلامیت کا رنگ مدھم ہوتا ہے، نفس پرستی کا رنگ غلبہ ہونے لگتا ہے۔ مالدار طبقات کے بلند معیار زندگی کو دیکھکر لوگ اسی طرز زندگی کے حریص ہونے لگتے ہیں، اگر کوشش کے باوجود اس طرح کی طرز زندگی نصیب نہیں ہوتی تو لوگ ذہنی دباؤ اور نفسیاتی نوعیت کی بیماریوں کا شکار ہونے لگتے ہیں، مال کی خاصیت ہی یہ ہے کہ فرد کی ہوس ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔

البتہ جو فرد اللہ کی طرف رجوع ہو کر اللہ سے محبت کرنے لگتا ہے تو اللہ اس کے دل سے مال کی محبت نکال دیتا ہے، اور اپنے ہاں اس کے رجوع کے عمل کو قبول کر کے اس کی توبہ کو قبول کرتا ہے۔

جہاں زیادہ دولت کی حرص فرد کو دولت پر ٹوٹ پڑنے پر ابھار کر، اسے دین سے دور کر سکتی ہے، وہاں افلاس اور محتاجی کی حالت بھی ایسی ہے، جو فرد وفرد کو کفر کی طرف لے جا

سکتی ہے، اس طرح کی کیفیت حدیث شریف بھی ہے، اس لئے جہاں دولت کی بہتات کی حرص سے بچنا ضروری ہے، وہاں افلاس، محتاجی اور بھوک کی حالت سے بچنے کی بھی اللہ سے خصوصی دعا کرنی چاہئے۔

پاکستانی ملت اس وقت بھوک، محتاجی، بے بسی اور افلاس کی حالت سے دوچار ہے، اس کی وجہ سے خودکشیاں ہو رہی ہیں اللہ ہماری حالت زار پر رحم فرمائے۔

اسلام میں سیاست کی اہمیت

فرمایا: بنی اسرائیل کی سیاسی قیادت انبیاء کرام کرتے تھے، جب کبھی نبی دنیا سے چلا جاتا تو دوسرا نبی اس کی جگہ آتا، میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، بلکہ خلفا ہوں گے۔ (بخاری شریف)

اس حدیث شریف میں سیاست اور سیاسی قیادت کی اہمیت واضح ہوتی ہے، سیاست کی اہمیت یہ ہے کہ اس کی وجہ سے قوم کے اجتماعی حالات میں فساد بھی پیدا ہوتا ہے تو بہتری بھی آتی ہے، اگر سیاسی قیادت نااہل ہے، قوم کے ساتھ مخلص نہیں، ذاتی مفادات کی اسیر ہے تو اس طرح کی قیادت قوم کو فریب دینے کا کردار ادا کر سکتی ہے، اس لئے ملک وملت کو بہتر سیاسی قیادت فراہم کرنے کا کام ایسا ہے، جو غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، اس سلسلے میں سارے دردمند طبقوں کو اپنے حصہ کا کردار ادا کرنا، یہ دینی فریضہ ہے، اس دینی فریضے میں کوتاہی ماقابل معافی جرم ہے، سیاست کی بہتری اور ریاستی اداروں کی طرف سے مثبت سوچ کو فروغ دینے سے لوگوں کی بہتر بنیادوں پر تربیت کا عمل شروع ہوتا ہے اور قوم کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پاکیزہ بنیادوں پر تشکیل ہونے میں مدد ملتی ہے، لیکن سیاسی پالیسیوں میں اگر سیکولر پالیسیوں کا غلبہ ہو تو رفتہ رفتہ قوم کا مزاج سیکولر بنیادوں پر ہونے لگتا ہے۔

سیاست پر اثر انداز ہونے والی قوتوں کو یہ نکتہ سمجھنا چاہئے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہماری ریاست اور ملت کی سلامتی اس بات سے وابستہ ہے کہ سیاست اور ریاست کو اسلامی خطوط پر تشکیل دیں اور ریاست کے ہر شعبہ میں اسلامی اصولوں کو اپنائیں، دوسری صورت میں اسلام کے نام پر قائم ہونے والی ریاست اور ملت پر بھوک، افلاس، اور بے بسی کی ایسی حالت طاری کر دی جائے گی کہ اس سے نکلنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے گی۔

قرآن کی بہت ساری آیتیں ماضی کی قوموں کے حوالے سے ہمارے لئے عبرت کی حیثیت رکھتی ہیں، قرآن میں کئی بستی کا بھی ذکر ہے، جو خوشحالی سے ہمکنار تھی، لیکن جب اس بستی کے لوگوں نے سرکشی کی راہ اختیار کی تو اس بستی کو ویرانی میں تبدیل کر دیا گیا۔

جہاد کی تین قسمیں

سب سے آخری جہاد، دل سے برائی کو برا سمجھنا

فرمایا: مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی مبعوث فرمایا تو اس کے کچھ مخلص ساتھی اور رفقاء ہوئے، جو اس کی سنت کو لیتے اور اس کے احکام کی اتباع کرتے، لیکن بعد میں ایسے ناخلف لوگ آتے ہیں، جو وہ باتیں کہتے ہیں، جو کرتے نہیں، وہ کام کرتے ہیں، جن کے کرنے کا انہیں حکم نہیں دیا گیا، تو جو شخص ایسے لوگوں سے اپنے ہاتھ سے جہاد کرے، وہ مومن ہے اور جو اپنی زبان سے جہاد کرے، وہ بھی مومن ہے اور جو دل سے جہاد کرے، وہ بھی مومن ہے، اس کے بعد رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان باقی نہیں رہتا۔ (صحیح مسلم)

اس حدیث شریف میں دین کی مخالفت کرنے والوں سے تین طرح سے جہاد کی تاکید فرمائی گئی ہے، ہاتھ سے، زبان سے، دل سے، اگر دل میں برائی کو برائی سمجھنے کا جذبہ موجود نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان رائی کے دانہ کے برابر بھی موجود نہیں۔

موجودہ حالات میں ہمیں جائزہ لینا چاہئے کہ اس اعتبار سے ہماری حالت کیا ہے۔

ہمارے ہاں مقتدر طبقات نے ایسا نظام تشکیل دیا ہے، جس میں اسلامیت سے دوری بڑھتی جارہی ہے، مادی طرز فکر میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے، نفسانفسی کی فضا بڑھ رہی ہے، لوگوں کے لئے جسم اور روح کے رشتے کو قائم رکھنا مشکل سے مشکل تر ہورہا ہے، مادی طرز فکر کے غلبے کی وجہ سے ذہنی اور نفسیاتی بیماریوں میں اضافہ ہورہا ہے، اسلام مسجد و مدرسے تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، سارے ریاستی ادارے اسلام واسلامیت سے محرومی کا منظر پیش کررہے ہیں، یہ ساری صورتحال ایسی ہے جس کی روک تھام جذبہ جہاد کے ذریعہ ہی ہوسکتی ہے، جس کا مذکورہ حدیث شریف میں ذکر ہے، لیکن جذبہ جہاد بھی مفقود ہوتا جارہا ہے، ایمان کے تحفظ کی آخری صورت باقی رہی ہے کہ کم از کم دل میں برائی کا احساس تو موجود ہو، برائی کو برا تو سمجھا جائے، برائی سے نفرت تو موجود ہو، اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر ایمان کی تو کوئی صورت ہی باقی نہیں رہتی۔ اللہ ہمارے ایمان کی حفاظت فرمائے۔

مشتبہ چیزوں سے بچاؤ کی تاکید

موجودہ دور میں مشتبہ چیزوں کی نشاندہی

فرمایا: حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے، ان دونوں کے درمیان بعض چیزیں شبہ کی ہیں، جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے (کہ حلال ہیں یا حرام) پھر جو شخص مشتبہ چیزوں سے بچ گیا، اس نے اپنے دین اور عزت کو بچالیا، اور جو کوئی ان مشکوک چیزوں میں پڑ گیا، اس کی مثال اس چرواہے کی سی ہے جو (شاہی) چراگاہ کے آس پاس اپنے جانوروں کو چرائے، قریب ہے کہ وہ کبھی اس چراگاہ کے اندر گھس جائے (اور شاہی مجرم قرار پائے) سن لو ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے، اللہ کی چراگاہ اس کی زمین پر حرام کردہ چیزیں ہیں۔ (صحیح بخاری)

یہ حدیث شریف بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں مشتبہ چیزوں سے بچنے کی غیر معمولی تاکید فرمائی گئی ہے، اگر مشتبہ چیزوں سے بچنے کا خصوصی اہتمام وانتظام نہ ہو تو فرد شاہی چراگاہ میں داخل ہو کر شاہی مجرم قرار پائے گا، اس طرح وہ اسلامی اعتبار سے خطرات سے دوچار ہوجائے گا، حلال اور حرام کی تعلیمات تو واضح ہیں، اس کا تو عام طور پر علم ہوتا ہے، لیکن مشتبہ چیزوں سے واقفیت نہیں ہوتی، اس ناواقفیت کی وجہ سے فرد اسلامیت کے خطرہ سے دوچار ہوجاتا ہے، نوبت ایمان گنوانے تک پہنچ جاتی ہے۔

اس دور میں جن چیزوں کو مشتبہ شمار کیا جاسکتا ہے، ان میں سے کچھ یہاں پیش کی جاتی ہیں، تاکہ اپنے اسلام کے تحفظ کی صورت اور اس کی فکر پیدا ہو۔

ایک بڑی چیز سوشل میڈیا کا غیر معمولی استعمال ہے، سوشل میڈیا میں شر کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے کہ اس سے پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، دنیا میں بے حیائی، نفس پرستی اور مادیت پرستی کی جو بھی طوفانی لہریں موجود ہیں، سوشل میڈیا اس کا مظہر ہے۔ سوشل میڈیا کو اگر موجودہ دور کی ناگزیر ضرورت ہی قرار دیا جائے، اس لئے کہ اس کے ذریعہ دینی شخصیتوں کو بھی لوگوں تک دین کا پیغام پہنچانے کا موقعہ ملتا ہے، اس ناگزیر مجبوری کی وجہ سے اگر اس کے جائز استعمال کی گنجائش نکل سکتی ہے تو اس کا زیادہ استعمال خطرات سے خالی نہیں، اس لئے کہ زیادہ استعمال سے حدود کے تجاوز سے بچنا دشوار تر ہے اور فرد کے لئے لادین نظریات کے اثرات اور بے حیائی کے مناظر سے بچنا محال ہوجاتا ہے، اس لئے یہ موجودہ دور میں سب سے بڑی مشتبہ چیز ہے، اس سے غیر محسوس طور پر فرد کی غلط ذہن سازی ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے بارے میں حوصلہ میں کمی واقع ہونے لگتی ہے۔

مشتبہ چیزوں میں دوسری چیز مسلمانوں کا لادین، ملحدانہ اور خالص مادیت پرستی پر مبنی ملکوں اور معاشروں میں قیام کرنا ہے، ان معاشروں میں فرد، ریاستی قوانین کے نظام میں اس طرح جکڑا ہوا ہے کہ اس کے لئے اپنی اور اپنی اولاد کی اسلامیت کو قائم رکھنا محال تر ہے، مثلا

وہاں اولاد میں سے کوئی لڑکا یا لڑکی کسی سے ناجائز جنسی تعلق قائم کرتی ہے، یا وہ اپنے دین سے باغی ہو کر دوسرا مذہب یا ملحدانہ نظریات اختیار کرتی ہے تو ان کو ایسا کرنے سے روکنا قانونی طور پر جرم ہے، اس کی سزا والدین کو گرفتاری کی صورت میں مل سکتی ہے۔

اس طرح کے ملحدانہ معاشروں میں مقیم ہونے کے نتیجے میں وہاں مسلمانوں کی تیسری نسل کا اسلام پر قائم رہنا دشوار ہی نہیں، ناممکن سا نظر آتا ہے، اس لئے کہ تیسری نسل کی ساری تربیت اور نشو ونما مادہ پرستی کی عمومی فضا اور ماحول میں ہوتی ہے۔ یہ چیز مشتبہ چیزوں میں شدید تر مشتبہ چیز شمار ہوتی ہے۔

تیسری چیز مسلمان معاشروں کے بعض شعبوں میں جہاں ایسا ماحول ہے کہ حرام سے بچنا دشوار تر ہے، یا ناجائز کام کرنے کا ایسا دباؤ موجود ہے کہ فرد کے لئے ناجائز کاموں سے بچنا محال تر ہے، اس طرح کے شعبوں سے منقطع ہو کر ایسے ماحول میں جانا ضروری ہے، جہاں فرد حرام ماحول سے بچ سکے اور جہاں اسلام و ایمان کے تحفظ کے لئے حالات سازگار ہوں۔

مشتبہ چیزوں میں مدارس کے بعض نئے فضلا کا ایسے اداروں میں ملازمت کرنا بھی شامل ہے، جہاں مادیت پسندی اور سیکولرازم (یعنی آزاد خیالی) کا ماحول غالب ہے، اس ماحول کے زیر اثر ان کی دینداری کو خطرہ لاحق ہوتا ہے، دیکھا گیا ہے کہ دینی مدارس سے فارغ ہونے والے بعض فضلا کا اس طرح کے ماحول کا حصہ بننے سے پہلے مرحلے پر ان کی ڈارھیوں کا عمل متاثر ہوا، دوسرے مرحلے پر ان کی نماز متاثر ہوئی۔ تیسرے مرحلے پر ان کی فکر میں سیکولرازم (آزاد خیالی) کے اثرات شامل ہونے لگے، کہا جاتا ہے کہ معاشی تنگی سے بچنے کے لئے ایسا کرنا ضروری ہوتا ہے، لیکن معاشی تنگی سے بچنے کے لئے ایک تو سادہ طرز زندگی اختیار کرنا ضروری ہے، دوسرے یہ کہ سارے وسائل کی خالق ہستی سے مانگنے کی نفسیات کا پیدا ہونا ضروری ہے، اللہ اپنے فضل خاص سے علم کی برکت اور اس کی طرف رجوع ہونے کی بدولت انہیں معاشی اعتبار سے دوسروں کا محتاج نہیں بنائے گا۔

مشتبہ چیزوں میں اور بھی چیزیں شامل ہیں، مثلا کاروبار میں بہت زیادہ منافع (جو آج کل عام ہے) جس سے عام لوگوں کی زندگی دشوار تر ہو جاتی ہے، اس سے لوگوں کی حق تلفی ہوتی ہے، پھر مال بنانے کے لئے کئی گنا زیادہ اسکیموں میں شرکت کرنا شدید مشتبہ ہے، اشیائے ضرورت کی چیزوں کی ذخیرہ اندوزی کرنا اور دولت کا چند طبقات میں مرتکز ہو جانا اور عام لوگوں کا محتاجی کی حالت میں مبتلا کرنا وغیرہ، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جو شاہی چراگاہ میں داخل ہونے کے مترادف ہیں، اگر اسلام اور ایمان عزیز ہے تو اس طرح کی ساری مشتبہ چیزوں سے بچنا ناگزیر ہے، جس کا اس حدیث شریف میں ذکر فرمایا گیا ہے۔

حرام مال کا نیکی کے کاموں میں استعمال

اللہ کے ہاں قطعا قبول نہیں

حدیث شریف میں ہے کہ اسلام میں شراب اور اس کی خرید و فروخت حرام قرار دی گئی تو ایک صاحب نے جن کا کاروبار شراب فروشی کا تھا اور انہوں نے اس سلسلے میں مال بھی جمع کیا تھا، انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اگر میں یہ مال نیک کاموں میں خرچ کروں تو میرے لئے مفید ہوگا، آپ نے فرمایا کہ اگر تم اسے حج یا جہاد وغیرہ میں بھی خرچ کرو گے تو اللہ کے نزدیک اس کی حیثیت ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہوگی، اللہ تعالٰی جائز چیز کے سوا کسی چیز کو قبول نہیں فرماتے۔"

اس حدیث شریف میں حرام سے کمائی گئی دولت کے بارے میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ وہ کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہو سکتی، اگرچہ اسے نیکی کے کاموں میں صرف کیا جائے، لیکن وہ نیکی میں شمار نہیں ہوگی، اللہ کے ہاں اس طرح کے مال کی مچھر کے پر کے برابر بھی حیثیت نہیں ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ بعض اصحاب سود یا رشوت یا قومی خزانہ کی لوٹ مار کے ذریعے کمائی گئی دولت کا ایک حصہ دینی کاموں میں خرچ کرتے ہیں، تاکہ حرام ذرائع سے کمائی ہوئی باقی

دولت کے جواز کی صورت پیدا ہو سکے، وہ اس کام کو نیکی کا کام سمجھ کر کرتے ہیں، اس حدیث شریف کی رو سے اللہ کے ہاں اس طرح کا مال ہرگز قطعاً قبول نہیں، نیکی کے کاموں میں بھی جائز مال ہی قبول ہوگا، جائز مال اگر تھوڑا ہی کیوں نہ ہو، اس میں خیر وبرکت ہوتی ہے۔

اس حدیث کی رو سے یہ غلط فہمی دور ہونی چاہے کہ حرام کمائی سے نیکی کا کام بھی ہو سکتا ہے اور اس طرح کے نیکی کے کام سے حرام کمائی کے جائز ہونے کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ متعدد اصحاب خوش فہمی میں ایسا سمجھنے لگتے ہیں، یہ حدیث شریف اس سلسلے میں قطعی حجت ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا، اسلام نے اس طرح کی تعلیمات کے ذریعے حرام کمائی کے سارے راستے بند کر دیئے۔

موجودہ دور میں کفر کی طاقتوں نے سیکولرازم کے لئے فضا کو ہموار کرنے یا اسلام سے سیکولرازم (آزاد خیالی) کے لئے جواز فراہم کرنے کے لئے دینی مدارس کے بعض نئے فارغ ہونے والے افراد کو مختلف بہانوں سے مالی تعاون فراہم کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، انہوں نے سادہ لوحی، یا معاشی تنگی کے پیش نظر یا جدیدیت سے ناآشنائی کی وجہ سے ان کے اس تعاون کو قبول کر کے، ان کی دی ہوئی لائین کے تحت کام شروع کیا ہے۔

اس طرح کا مالی تعاون قبول کرنا بھی حرام کے زمرے میں ہی آتا ہے، بلکہ یہ اس اعتبار سے مزید نقصان دہ ہے کہ اس سے اسلام کی صاف وشفاف تعلیم میں جدیدیت (آزاد خیالی) کی آمیزش ہوتی ہے، اس طرح اسلام کے نام پر اسلام سے متصادم جدیدیت و سیکولرازم کے لئے فضا ہموار ہوتی ہے۔

چونکہ یہ اہم معاملہ ہے، اس لئے اس کی مزید تشریح کرنا ضروری ہے، طاغوت کی عالمی قوت کی کاوش ہے کہ مذہبی رواداری کے نام پر اسلامی فکر کی ایسی تشریح کی جائے، جس میں نہ صرف سیکولرازم کی گنجائش پیدا ہو، بلکہ اس کے لئے حالات سازگار ہوں اور مسلم

معاشرہ مذہب کو مسجد و مدرسہ اور نکاح وغیرہ کی حد تک محدود رکھنے پر تیار ہو، اور دین کے نام پر پیدا ہونے والی حمیت باقی نہ رہے، یہ وہ کام ہے، جس کے لئے باصلاحیت مذہبی شخصیتوں کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور مزید حاصل کی جارہی ہے، اور ان کے ساتھ مالی معاونت کی جارہی ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ موجودہ دور میں علمائے کرام دین کے تحفظ اور اس کے تسلسل کو قائم رکھنے کے سلسلے میں جو کردار ادا کر رہے ہیں، وہ مثالی نوعیت کا کردار ہے۔

ہمارے معاشرہ میں موجود دینداری انہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے، طاغوت کی عالمی قوت چاہتی ہے کہ دینی مدارس پر کنٹرول کیا جائے اور علماء کرام کو معاشرہ میں متنازع بنایا جائے، اس طرح کے حالات میں سادگی اور کفایت شعاری سے وقت گزار کر دینی سرگرمیوں کو جاری رکھنا، یہ علماء کرام کا مستقل کا کام ہے۔

ہم نے بعض علماء پر جو تنقید کی ہے، یا جن چیزوں کی نشاندہی کی ہے، اس میں جذبہ اپنائیت شامل ہے اور مزید احتیاط کرنے کی توجہ دلانے کا داعیہ بھی۔

گناہوں سے قلب پر سیاہی کا چھا جانا

فرمایا نبی ﷺ نے: جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، اگر اس نے توبہ واستغفار کر لیا تو سیاہی مٹ جاتی ہے اور دل صاف ہو جاتا ہے، لیکن اگر اس نے اس گناہ سے توبہ نہ کی اور دوسرا گناہ کر لیا تو ایک دوسرا سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے اور اسی طرح ہر گناہ پر سیاہ نقطے لگتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ یہ سیاہی سارے قلب پر محیط ہوتی ہے، اسی ظلمت وسیاہی کا نام قرآن کریم میں "ران" آیا ہے۔ (مسند احمد)

اس حدیث شریف میں قرآن کی آیت کلا بل ران علیٰ قلوبھم بما کانوا یکسبون. (ہرگز نہیں بلکہ ان کے کرتوتوں کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گیا ہے جو وہ کیا کرتے تھے)

کی تشریح فرمائی گئی ہے، یہ حدیث شریف دراصل انسان کی عادتوں سے بحث کرتی ہے کہ انسان عادتوں کا اسیر ہے، وہ اگر بار بار منفی عادتوں کو اختیار کرتا ہے تو وہ عادتیں رفتہ رفتہ اتنی پختہ ہو جاتی ہیں کہ وہ مزاج کا حصہ بن جاتی ہیں، ان سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے اور گناہوں کی سیاہی دل کا احاطہ کر لیتی ہے کہ زندگی بھر سیاہی کے ان اثرات سے نکلنا دشوار ہو جاتا ہے، گناہ کی خاصیت ہے کہ اگر فرد بروقت سنبھل کر اس سے توبہ تائب نہیں ہوا اگر تو اس گناہ کی عادت مستحکم ہونے لگتی ہے، دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ایک گناہ اپنے ساتھ دوسرا اور تیسرا گناہ بھی لاتا ہے، اس طرح فرد کی شخصیت گناہوں کی دلدل میں مبتلا ہونے لگتی ہے، گناہوں سے بچنے کی ایک تو صورت یہ ہے کہ فرد بروقت متنبہ ہو کر ہر گناہ سے باز آجائے، اس طرح وہ گناہوں کے گھیراؤ سے بچ جائے گا، گناہوں سے بچنے کی دوسری بہتر صورت یہ ہے کہ فرد دل کو بنانے کی کوشش کرے کہ دل کسی طرح اللہ کی محبت سے سرشار ہو جائے اور اللہ کے خوف سے لبریز ہو جائے اور دل پر آخرت کی فکر غالب ہو جائے۔ جب دل بن جائے گا تو دل میں گناہوں سے کراہت کی طلب پیدا ہوگی اور دل مجبور کرے گا فرد کو ہر طرح کے گناہوں سے بچنے کا کردار ادا کرے گی۔

ہر فرد کا دوسروں پر نگران ہونا
اور نگران سے اس کی رعیت کے بارے میں محاسبہ کرنا

فرمایا: تم میں سے ہر شخص نگہبان (ذمہ دار) ہے، اور اس سے اس کے زیر نگرانی رہنے والے افراد کے متعلق پوچھ گچھ کی جائے گی۔ (مشکوٰۃ)

ذمہ داری میں حکمران کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہے کہ وہ لوگوں کی جان ومال وعزت آبرو کی حفاظت کا اہتمام کرے، امن وامان کے لئے حالات کو سازگار بنائے، مہنگائی کو بڑھنے نہ دے، تاکہ لوگوں کی زندگی اجیرن بننے سے بچ سکے، لوگوں کو سستا انصاف فراہم کرنے کی صورت پیدا کرے، ملک میں سیاسی طور پر کشیدگی کا ماحول پیدا نہ ہونے دے، اپنے مخالفین کی پکڑ دھکڑ کی بجائے مہذبانہ طور پر پیش آنے کے لئے کوشاں ہو۔

گھر میں مرد کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ گھر والوں کی ضروریات پوری کرنے کی مساعی کرے، ان کی بہتر سے بہتر تربیت کا انتظام کرے، گھر کے ماحول کو کسی صورت میں کشیدہ نہ ہونے دے، اسلامی نقطہ نگاہ سے سب کی ذہن سازی کرے، معاشرے کی خرابیوں سے ان کو بچانے کے لئے حالات سازگار بنائے۔

ذمہ دار اور نگران کو اپنی رعایا اور اپنے ماتحت افراد کے بارے میں باز پرس ہوگی، اس لئے نگران کو اپنی رعایا کے بارے میں غافل اور غیر ذمہ دار نہیں ہونا چاہئے، یہ سخت خسارہ کا سودہ ہے۔

اس حدیث کی رُو سے والدین، سربراہان خاندان، تعلیمی اداروں یعنی مدارس، مکاتب، اسکولوں، کالجوں وغیرہ کے ارباب انتظام پر بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے زیر اثر اور زیر تعلیم افراد کی بہتر طور پر نگرانی کرنے کی کوشش کریں اور انہیں بُرائی کی طرف جانے سے روکیں، موجودہ دور میں انٹرنیٹ کا غلط استعمال بہت بڑی اخلاقی بیماری ہے، جس سے ذہن اور مزاج کی منفی بنیادوں پر تشکیل ہونے لگتی ہے اور افراد کے لئے مادیت پسندی کے رجحانات سے بچنا دشوار ہو جاتا ہے، اس سلسلے میں نگران اور ذمہ دار افراد کو چوکنا ہو کر، اپنے زیر اثر افراد کی نگرانی کرنی ہوگی۔

اگر نگراں اپنے ماتحتوں کے حوالے سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرے تو اس سے ملک اور حالات میں بھی بہتری کی صورت پیدا ہوتی ہے تو ساتھ ساتھ بہتر تربیت کا ماحول بھی پیدا ہوتا ہے، آخرت میں ذمہ دار اور نگران کی بچاؤ کی صورت بھی پیدا ہوگی۔

فرد کا صبح کے وقت گھر سے نکلنے کے وقت سے
نفس کے حوالے ہو جانا

فرمایا: پاکیزگی نصف ایمان ہے، الحمدللہ کہنا میزان کو بھر دیتا ہے اور سبحان اللہ اور الحمدللہ کہنا یہ آسمان وزمین کے درمیانی خلا کو بھر دیتا ہے اور نماز روشنی ہے (جس سے دنیا میں حق کی طرف رہنمائی ملتی ہے، اور آخرت میں پل صراط سے گزرتے وقت یہ روشنی مومن

کے کام آئے گی) صدقہ دلیل ہے (اس بات پر کہ اس کا ادا کرنے والا مومن ہے) صبر روشنی ہے، قرآن تیرے لئے حجت ہے (اگر اس پر عمل کیا جائے بصورت دیگر) تیرے خلاف دلیل ہے ہر شخص صبح اپنے کاموں میں نکلنے والا ہے، اور وہ اپنے نفس کا سودہ ہے پس اسے (عذاب سے) آزاد کرنے والا ہے یا اس کو (اللہ کی رحمت سے محروم کر کے) ہلاک کرنے والا ہے۔ (صحیح مسلم)

اس حدیث میں بیان کردہ ساری چیزیں اہم ہیں اور اسلام کے تقاضوں میں شامل ہیں اور ایمان میں اضافہ کا ذریعہ بھی۔ لیکن حدیث کے آخر میں جو نکتہ بیان ہوا ہے، وہ غیر معمولی طور پر اہمیت کا حامل ہے، جس پر غور و فکر کرنا ضروری ہے، وہ نکتہ یہ ہے کہ ہر شخص صبح کے وقت گھر سے نکلتا ہے، اور مادی مصروفیات میں شریک ہو جاتا ہے تو وہ نفس کے حوالے ہو جاتا ہے، اگر نفس کی حالت بہتر ہے اور اس میں نیکی کی استعداد موجود ہے تو وہ مادی مصروفیات میں رہ کر، نفس پرستی، دنیاداری اور حلال و حرام سے بے نیاز ہو کر مال کمانے میں مصروف نہ ہو گا، اس طرح مادی مصروفیتیں اسے عذاب سے بچانے کا ذریعہ بن جائیں گی، اگر نفس پر محنت نہیں ہے، اللہ سے غفلت کا مزاج غالب ہے تو مادی مصروفیات میں رہ کر نفس اسے اللہ کی رحمت سے دور کر کے اس کی ہلاکت کا ذریعہ بنے گا۔

صبح کو گھر سے نکلنے کے بعد فرد کو بیشمار ایسے مسائل سے واسطہ پڑتا ہے، جہاں جھوٹ بولنے، خیانت کرنے، دھوکہ سے مال کمانے، دوسروں کو اذیت دینے، اور گلا غیبت کرنے کے مواقع ملتے ہیں، اگر نفس کی ایمانی حالت بہتر ہے یعنی نفس لوامہ غالب ہے تو وہ اس طرح کی ساری غیر اسلامی حرکات سے بچ جائے گا، دوسری صورت میں وہ ان گناہوں میں مبتلا ہو کر اپنے لئے ہلاکت کا سامان تیار کرے گا۔

ڈاکٹر حسیب احمد خان

تجدد پسندی سے الحاد تک (ایک واقعاتی قصہ)

یہ ان دنوں کا قصہ ہے کہ میں نے انٹر کا امتحان پاس کیا تھا، بی کام کر رہا تھا، ایک طرف تو نوکری کی تلاش تھی تو دوسری جانب کتابوں کا شوق۔ اس لیے بہت سا وقت لائبریریوں میں گزرتا تھا، یہ وہ دور تھا کہ جب میں نے متعدد کتب کا مطالعہ کیا، اردو ادب سے انگریزی ادب اور خاص کر دینی علوم سے متعلق بے شمار کتب اسی دور میں پڑھیں، ساتھ ہی ساتھ تبلیغی جماعت کے ساتھ بھی وقت لگتا رہا اور کچھ ادبی حلقوں میں بھی بیٹھک شروع ہوئی، انہی دنوں مختلف مکاتب فکر کے دینی اداروں اور مراکز میں جانے کا سلسلہ بھی رہا اور مطالعے کے ساتھ ساتھ مباحثے اور مکالمے کا شعور بھی پیدا ہوا۔

اس زمانے میں ہم لوگ نئے نئے نارتھ کراچی منتقل ہوئے تھے، وہاں ایک صاحب ملے اور انہوں نے سنت کی ایک مختلف تعبیر رکھنے والے گروہ سے متعارف کروایا، اس زمانے میں روایتی مذہبی طبقات سے بخوبی واقف تھا، ذاتی حیثیت میں دیوبند مکتب فکر سے منسلک تھا (الحمد للہ آج بھی ہوں) لیکن دیگر روایتی مسالک کے لوگوں سے ضرور واقفیت رہتی تھی، خاص کر میرے حلقے میں بہت سے بریلوی اور اہل حدیث احباب بھی موجود تھے۔ اسی طرح چونکہ میں نے جماعت اسلامی کے اسکول سے پڑھا تھا تو جماعتی حلقوں میں بھی آنا جانا تھا، دوسری جانب ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم سے چونکہ میرے بڑوں کے خاندانی تعلقات رہے تھے، وہ میرے دادا کے بڑے بھائی مولانا برکات احمد خان کے شاگرد تھے اور حصار میں میرے نانا ظہور احمد خان صاحب کے ہم مکتب تھے، اس لیے تنظیم کے حلقوں سے بھی بخوبی واقفیت تھی، سو ان تمام طبقات میں جانا رہتا تھا، لیکن میں ذکر کر رہا ہوں ایک نئی تعبیر رکھنے والوں کا،

تونارتھ کراچی میں ایک صاحب سے تعلق ہوااورانہوں نے مجھے اس جدید تعبیر سے متعارف کروایا خاص عنوان پر ان سے مباحث کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ وہ صاحب مجھے کسی بھی انداز میں قائل کرنے میں ناکام رہے تو انہوں نے مجھے دعوت دی کہ آپ ہمارے ساتھ ہمارے مرکز چلیں ایک دن میں ان کے ساتھ ان کے مرکز بہادر آباد ''دانش سرا'' کراچی چلا گیا، وہاں پر ان کے ایک بڑے مفکر کا بیان تھااور میں پہلی بار انہیں سن رہا تھا، مجھے بتایا گیا کہ موصوف بہت بڑی علمی شخصیت ہیں اوراس دور میں دین کا بڑا کام کررہے ہیں، اسی مرکز میں میری ملاقات ایک نوجوان عالم سے بھی کروائی گئی اوران کی بابت یہ معلوم ہوا کہ بنوری ٹاؤن کے فاضل ہیں اور دیوبند سے تعلق ہوکر ان مجدد صاحب کے حلقہ دام میں الجھ بیٹھے ہیں۔ موصوف کو اپنے ایک بزرگ مفتی ولی حسن ٹونکی کا حوالہ دیا کہ جو اپنے دور کے ایک بڑے دیوبندی عالم گزرے ہیں تو موصوف انہیں پہچان گئے، میں نے ان سے سوال کیا کہ آپ کے اندر اتنی بڑی فکری تبدیلی کیسے آئی؟ تو کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے، بہر حال اس دن ان بڑے تجدد پسند صاحب کا لیکچر سنااور بہت سی باتوں کے متعلق ابہام اور تشویش پیدا ہوئی ایک موقع پر اپنی عادت سے مجبور ہوکر میں نے ان سے دو سوال پوچھے۔

پہلا سوال: آپ کا مروجہ درس نظامی سے متعلق کیا خیال ہے؟

اس پر موصوف نے فرمایا کہ یہ ایک مردہ ہے جسے دفنا دینا چاہیے اوراس کی یادگار کو کسی میوزیم میں رکھ دینا چاہیے۔

دوسرا سوال: آپ کے کام کا حقیقی مقصود کیا ہے؟

اس پر موصوف نے فرمایا کہ دین کی وہ روایت جو پچھلے ساڑھے تیرہ سو سال سے پوشیدہ ہے، ہم اس کو سامنے لاکر دین کی تشکیل نو کرنا چاہتے ہیں۔

ان دو جوابات سے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ موصوف کا قبلہ درست نہیں ہے، بہر حال موصوف کے کچھ ریکارڈ بیانات جو کے انہی کے ادارے سے آڈیو کیسٹ کی شکل میں مل گئے

اور ''میزان'' نامی کتاب ہاتھ آئی کہ جس کا مطالعہ کیا اوراسی دور میں میرے اندر اس تجدد پسند گروہ کی مخالفت کا بیج پیدا ہوااور مجھے اسی گروہ کی مخالفت نے روایت اور روایت پسند حلقوں سے قریب تر کر دیا، اس رویے کی وجہ کیا بنی؟ اس کے پیچھے موجود کہانی آپ کے سامنے رکھتا ہوں، اس طویل لیکن ضروری تمہید پر معذرت۔

قصہ کیا ہے؟

قصہ کچھ یوں ہے کہ جو موصوف مجھے اس گروہ کی طرف لیکر گئے تھے، انہوں نے اس حلقے میں جانے والے کچھ نوجوانوں سے ملاقات کروائی، اس دور میں یہ نوجوان بہادر آباد ''دانش سرا'' کے دورے بھی کرتے تھے اور کراچی پیالہ ہوٹل کی ایک مسجد میں بھی جاتے تھے، اس مسجد والے خود کو ''مسلمین'' کے نام سے متعارف کرواتے تھے (یہ معروف جماعت المسلمین کی ایک ذیلی شاخ ہے) بہر حال یہ کہانی کسی اور دن۔

وہ نوجوان ہمارے کے خاندان سے تھے، جو صاحب مجھے لیکر گئے تھے، وہ بھی دہلی پنجابی سوداگران کے سنار خاندان سے تھے، یہ وہ نوجوان تھے کہ جو ابتدائی طور پر میری طرح تبلیغی جماعت سے متاثر ہوکر دین کی طرف آئے تھے، بعد ازاں دین کا مطالعہ اور علماء سے تعلق نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اندر علمی واعتقادی پختگی نہ آسکی اور کسی بزرگ سے تعلق نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اندر روحانی بیداری بھی پیدا نہ ہوسکی اور اپنی اسی کمی کی وجہ سے وہ اس تجدد پسند حلقے کی دام صدرنگ میں پھنستے چلے گئے۔

ان نوجوانوں سے مباحث کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا، بعد ازاں ان سے تعلق قائم نہ رہ سکااور پھر ان کے حوالے سے بعض افسوس ناک قسم کی خبریں بھی ملیں، قصہ مختصر ان کے رویے میں بتدریج تبدیلیاں پیدا ہونا شروع ہوگئیں اور وہ تبدیلیاں ذیل میں درج ہیں۔

سب سے پہلے تو انہیں یہ بتایا گیا کہ جو ٹوپی آپ کے سر پر ہے، درحقیقت یہ صرف ایک رواج ہے اوراس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ جو داڑھی آپ نے رکھی ہوئی ہے یہ

عرب ثقافت کا مظہر ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں اور خاص طور پر لباس کا مذہب سے کوئی لینا دینا نہیں۔

کچھ ہی عرصے میں ان کے سروں سے ٹوپیاں غائب ہو گئیں، ان کی داڑھیاں صاف ہو گئیں اور آہستہ آہستہ ان کا لباس تبدیل ہونا شروع ہو گیا، یہ وہ پہلی سیڑھی تھی کہ جو دینی روایت کی بلند و بالا عمارت سے اتر کر کسی پاتال کی طرف جاتی تھی۔

دوسرے درجے میں ان کے ذہن میں مذہبی شخصیات خاص کر علماء اور مشائخ کے حوالے سے متعدد اشکالات پیدا کیے گئے، کہیں پر انہیں مشاجرات کی بحث میں الجھایا گیا اور کہیں پر وہ اولیاءاللہ اور صوفیاء کے حوالے سے شدید ابہام کا شکار ہو گئے، یہاں پر ان کا تعلق دینی روایت سے ٹوٹنا شروع ہو چکا تھا۔

تیسرے درجے میں ان کے قلوب میں فقہ اسلامی کے حوالے سے عجیب وغریب قسم کے اشکالات پیدا کیے گئے، ابتدائی طور پر فقہی آراء کو نصوص سے متصادم قرار دیا گیا اور تقلید کو کفر کے قریب قریب شمار کروایا گیا اور انہیں ایک مخصوص علمی کتابی دین کی طرف راغب کرنے کی بات ہوئی۔

چوتھے درجے میں براہ راست احادیث مبارکہ پر ان کے اذہان میں اشکالات پیدا ہو گئے اور وہ آہستہ آہستہ احادیث نبوی ﷺ سے دوری کا شکار ہوتے چلے گئے۔

یہ وہ دور تھا کہ جب وہ نوجوان تجدد پسندوں کے اس حلقے سے نکل کر ایک دوسرے گروہ سے قریب ہوئے کہ جو "طلوع" اسلام کا پرچار تھا اور اپنی خواہشات قرآن سے بتاتا تھا اس کے بعد وہ نوجوان اس دوسرے تجدد پسند حلقے سے قریب ہونا شروع ہوئے اور آہستہ آہستہ ان کا رابطہ دین کی روایت سے مکمل طور پر قطع ہو گیا۔

اس کے بعد پانچواں دور شروع ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ ان کے اذہان میں قرآن کریم سے متعلق بھی کچھ اشکالات پیدا ہو چکے ہیں اور اب وہ خود کو ہیومنسٹ قرار دیتے ہیں گو کہ پہلے

ہی ان کے اندر لبرل اور سیکولر سوچ پیدا ہو چکی تھی، لیکن عرف عام میں ہیومنسٹ ہو جانا در حقیقت الحاد کی حدود میں داخل ہو جانا تھا۔

چھٹا دور دور تشکیک تھا، اب ان کا ذہن خدا کی ہستی بھی مشکوک ہو چلا تھا اور بہت سے سوالات ان کے ذہن میں تھے۔

مجھے نہیں معلوم کہ آخری درجے یعنی خالص دہریت کی سیڑھی وہ اترے یا نہیں؟ مگر یہ آخری منزل اب کچھ زیادہ دور نہیں تھی، اس کے بعد ان سے کوئی رابطہ نہ رہا۔

یہ بیس ایک سال پرانی کہانی ہے، اس دوران زندگی کے مختلف ادوار دیکھے، تعلیمی سفر طے کرتے کرتے میں پی ایچ ڈی کی سطح تک پہنچ گیا، لیکن بیس ایک سال پہلے ہی میں دفاع دین کے ایک شعبے کا تعین کر چکا تھا، مجھے بخوبی معلوم ہو چکا تھا کہ ہمارے معاشروں میں الحاد ودہریت کی راہ تجدد پسندی کے راستے سے ہموار ہوتی ہے اور مجھے اس حوالے سے کام کرنا ہے، سو آج بھی اسی شعبے کے حوالے سے محنت جاری ہے۔

آج بھی جب میں کسی نوجوان کو تجدد پسندی کے راستے پر قدم رکھتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے خدشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ کہیں یہ شخص الحاد ودہریت کی پاتال میں نہ جا گرے، اسی لیے میں دینی روایت کی بہت سی ابتدائی چیزوں کے حوالے سے بھی شدید قسم کی حساسیت کا اظہار کرتا ہوں کہ جو ہمارے بعض دوستوں کو انتہائی ناگوار بھی گزرتی ہے، مجھے نہیں معلوم کہ یہ حساسیت درست ہے یا نہیں؟ لیکن مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ تجدد پسندی کا یہ بیج آخر کار انسان کو دہریت کے شجر خبیثہ پر چڑھا دیتا ہے۔

اللہ رب العزت ہمیں اور ہماری نوجوان نسل کو اس فتنے کے دور میں اس دور کے سب سے بڑے فتنے سے محفوظ رکھے اور نبی کریم ﷺ کی روایات پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

غلامانہ ذہنیت کا ورثہ ٹوٹنے نہ پائے!

مغرب کے علمی مراکز کی آواز

اے مسلمانو! کیا تم سنتے ہو؟

مغرب کی درسگاہوں، تحقیقاتی اداروں اور علمی مراکز سے مسلسل ایک آواز ہم سے مخاطب ہے، مگر افسوس کوئی اس پر توجہ نہیں دیتا، کسی کا خون جوش نہیں مارتا اور کسی کی غیرت نہیں جاگتی۔ یہ آواز کہتی ہے:

اے مسلمانو! اے ہمارے غلامو! سنو! تمہارے اقبال کے دن گزر گئے، تمہارے علم کے کنویں سوکھ گئے اور تمہارے اقتدار کا سورج ڈوب گیا، اب تمہیں حکمرانی اور سلطانی سے کیا واسطہ؟ تمہارے بازو اب شل ہو گئے اور تمہاری تلواریں زنگ آلود۔ اب ہم تمہارے آقا ہیں اور تم سب ہمارے غلام ہو۔

دیکھو! ہم نے سر سے پاؤں تک کیسا تمہیں اپنی غلامی کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ ہمارا لباس پہن کر اور ہماری زبان بول کر اور ہمارے طور طریقے اختیار کر کے تمہارے سر فخر سے بلند ہو جاتے ہیں۔ تمہارے چھوٹے چھوٹے معصوم بچے ہمارا قومی نشان اور مذہبی شعار ٹائی لگا کر اسکول جاتے ہیں تو اس لباس کو دیکھ کر کیسا تمہارا دل خوش ہوتا ہے۔

ہم بے وقوف نہیں تھے۔ پہلے ہم نے تمہارے دل و دماغ کو اپنا غلام بنایا۔ اب تم ہماری آنکھوں سے دیکھتے ہو، ہمارے کانوں سے سنتے ہو اور ہمارے دماغ سے سوچتے ہو۔ اب تمہارے وجود میں تمہارا اپنا کچھ نہیں۔

اب تم ہر شعبہ زندگی میں ہمارے محتاج ہو۔ تمہارے گھروں میں ہمارے طور طریقے ہیں۔ تمہارے دماغوں میں ہمارے افکار ہیں۔ تمہارے اسکولوں اور کالجوں میں ہمارا مرتب کیا ہوا نصاب ہے۔ تمہارے بازاروں میں ہمارا سامان ہے اور تمہاری جیبوں میں ہمارا سکہ ہے۔ تمہارے سکے کو ہم پہلے ہی مٹی کر چکے ہیں۔

تم ہمارے حکم سے کیسے سرتابی کر سکتے ہو؟ تم ہمارے اربوں اور کھربوں روپے کے قرض دار ہو۔ تمہاری معیشت ہمارے قبضے میں، تمہاری منڈیاں ہمارے حکم و کرم پر ہیں اور تمہارے سارے تجارتی ادارے صبح اٹھتے ہی ہمارے سکے کو سلام کرتے ہیں۔ تمہیں اپنے جوانوں پر بڑا ناز تھا۔ تم کہتے تھے۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی!

تو سنو! اس زرخیز زمین کو ہم نے ہیروئن بھرے سگریٹ، شہوت انگیز تصویروں، زنا کے ہیجان مناظر سے لبریز فلموں اور ہوسِ زر کا آبِ شور ملا کر کے بنجر کر دیا ہے۔ تمہیں اپنی افواج پر بھی بڑا گھمنڈ تھا۔ اب جاؤ! اپنی فوج کے اسلحہ خانوں کو دیکھو۔ اگر ہم ہاتھ روک لیں تو تمہارا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ اب تم بغیر ہم سے اجازت لیے کسی پر فوج کشی نہیں کر سکتے۔ بوسنیا اور عراق کے حشر کو ہمیشہ یاد رکھنا۔ جاؤ! اب عافیت اسی میں ہے کہ جو طرز حیات اور طرز حکومت ہم نے تمہیں سکھایا ہے، اس سے سرمو انحراف نہ کرنا۔ خبردار! ہماری غلامی سے نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔ ہمیں امید بھی یہی ہے کہ تم برسوں تک ایسا نہ کر سکو گے، کیونکہ اس کوشش کے جتنے محرکات ہو سکتے تھے یعنی ایمان کی پختگی، جوشِ جہاد، بالغ نظری، غیرت وہ سب ہم نے تمہارے دانشوروں، مفکروں اور عالموں سے دنیا کی چند آسائشی چیزیں دے کر خرید لئے ہیں۔

ہم نے تمہاری عورتوں کو ٹی وی کے ذریعے بے حیائی کی ترغیب دے کر، سنگھار و آرائش حسن کا بہترین سامان دے کر ان کی چادر اتروا دی ہے اور تمہارے مردوں کو عریاں

اور فحش فلمیں دکھا کر ان کی مردانگی کی جڑ کاٹ دی ہے۔ اب تمہارے یہاں کوئی خالد، کوئی طارق، کوئی صلاح الدین اور کوئی ٹیپو پیدا نہیں ہو سکتا۔

اور سنو! ہم احسان فراموش نہیں ہیں۔ تمہاری قوم کے کچھ احسان بھی ہم پر ہیں۔ خاص طور پر تمہارے علماء کے، جنہوں نے اپنی مسجدوں اور مدرسوں میں بیٹھ کر ایک دوسرے کی تکفیر کر کے آپس میں لڑ کر ہماری تہذیب و افکار کے لیے راستہ صاف کیا۔ تمہارے دانشوروں اور مفکروں نے ترقی یافتہ اور ماڈرن کہلانے کے شوق میں ملحد اور زندیق بن کر ہمارے فلسفے کی اشاعت کی۔ تمہاری تعلیم گاہوں نے ہمارا نصاب تمہارے نوجوانوں کے دل و دماغ میں ہم سے بہتر طریقے سے اتار کر اپنے مذہب سے بغاوت پر اکسایا۔ تمہارے صاحبانِ اقتدار اپنے سارے وسائل تمہیں بے حیا، بے غیرت اور بے دین، بنیاد پرست اور دہشت گرد بنانے کے لیے ہمارے ہی اشاروں پر استعمال کرتے آئے ہیں۔ ہم ان سب کے شکر گزار ہیں۔

تمہارے مذہب نے کیسی کیسی پابندیاں تم پر لگا رکھی تھیں۔ یہ حرام وہ حرام، یہ جائز وہ ناجائز۔ زندگی کی راہیں تم پر تنگ کر دی تھیں۔ ہم نے تمہیں زندگی کا نیا راستہ دکھایا اور تمہیں حرام و حلال کی قید سے آزاد کر دیا۔ کیا تم اس پر ہمارا شکر ادا نہ کرو گے؟

اے مسلمانو! اے ہمارے غلامو! کیا تم سن رہے ہو؟

محمد موسیٰ بھٹو

خیالی قوت کی اہمیت

اور زندگی کو بنانے اور بگاڑنے میں

اس کا کردار

اچھے دور کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ اس میں اچھے خیالات لوگوں میں منتقل ہوتے رہتے ہیں اور اچھے خیالات کے لئے غیر معمولی مجاہدوں کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی۔ ہمارے ایک دور میں اچھے لوگوں کی بہتات تھی، جس کی وجہ سے منفی خیالی قوت اور نفس کی قوتوں کو غلبہ پانے کا موقعہ کم ہی ملتا تھا، اس لئے کہ اچھے لوگوں کی خیالی قوت دوسروں پر اثر انداز ہو کر، ان کی شخصیت کی تعمیر میں کردار ادا کرتی تھی، اس لئے اس دور میں معاشرہ ہمہ گیر فساد کی صورت اختیار کرنے سے محفوظ ہوتا تھا، لیکن جب معاشرہ میں بے قابو یافتہ افراد کی اکثریت ہو جاتی ہے تو اس سے منفی خیالی قوت اور نفس کی شہ روزی کو کام کرنے کا موقعہ ملتا ہے، جس سے معاشرہ میں فساد بڑھنے لگتا ہے، ایسے دور میں اس بات کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے کہ خیالات کو پاکیزہ بنانے کے عمل کو زیادہ اہمیت دی جائے۔

ویسے بھی اسلام میں خیالات کو پاکیزہ اور خدا پرستی سے ہم آہنگ بنانے پر زور دیا گیا ہے بلکہ حدیث شریف میں تفکر کرتے رہنے کو ساٹھ سال کی عبادت سے زیادہ اہمیت کا حامل قرار دیا گیا ہے، خود اللہ کے رسول اللہ ﷺ نبوت سے پہلے غار حرا میں تفکر (مراقبہ) کرتے تھے۔

اس دور میں جب منفی خیالی قوت کے زیر اثر منفی اعمال کا غلبہ ہو گیا ہے، خیالی قوت کو پاکیزہ صورت دینے کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

خیالی قوت کی مثال برقی قوت سے دی جاسکتی ہے، جس طرح ہم بجلی کے سامنے بلب لگادیتے ہیں تو روشنی حاصل کر لیتے ہیں، پنکھا لگا دیتے ہیں تو ہوا آنے لگتی ہے، اگر پانی مشین چلانا چاہتے ہیں تو اس آلہ کے ذریعہ پانی کی مشین چلنا شروع ہو جاتی ہے، اسی بجلی سے ہم کارخانوں میں بڑی بڑی مشینیں چلا لیتے ہیں، کمرے گرم اور ٹھنڈے کر لیتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ بجلی کی بے پناہ قوت کے سامنے ہم جو آلہ جوڑے دیتے ہیں، اسی کے مطابق کام لے لیتے ہیں۔

زندگی کو بنانے اور بگاڑنے کے سلسلے میں یہی کردار خیالی قوت بھی ادا کرتی ہے، مثبت اور پاکیزہ خیالی قوت سے ہم قرب خداوندی بھی حاصل کرسکتے ہیں تو مادی ترقی کو پیش نظر رکھکر، خیالی قوت کو ایک مرکزی نکتہ پر مرکوز کرنے سے مادی ترقی بھی حاصل کرسکتے ہیں، جب کہ خیالات کے انتشار سے نہ صرف یہ کہ کوئی کام صحیح طریقہ سے نہیں ہوتا، بلکہ بنایا کام بھی بگڑنے لگتا ہے، آج ہماری عبادات بے روح کیوں ہیں کہ اس سے پاکیزہ کردار کی تشکیل ہی نہیں ہوتی؟ اس کا سبب یہ ہے کہ خیالی قوت کو مہذب بنانے اور اللہ سے لو لگانے کے کام سے غفلت ہے، جس کی وجہ سے خیالات منتشر رہتے ہیں، اور عبادت میں توجہ اور یکسوئی حاصل نہیں ہو پاتی اور خیالات کا ہجوم ہوتا ہے، جو عین نماز کے موقعہ پر بھی سامنے آتا ہے۔

منتشر خیالات سے نہ تو خدا ملتا ہے اور نہ ہی دنیا حاصل ہوتی ہے، منتشر خیالات کے حامل گردہ پر طاقتور مادی خیالات کی حامل قوم غالب آجاتی ہے، جو اس وقت عملاً ہو رہا ہے۔

خیالی قوت محض خیالی قوت نہیں ہوتی، بلکہ وہ یا تو نفس پرستی کی قوتوں کے تابع ہوتی ہے، جس سے زندگی، خواہشات نفس کی بنیاد پر استوار ہونے لگتی ہے اور مادی خیالات شخصیت کو جکڑ لینے کا ذریعہ بنتے ہیں، یا پھر خیالی قوت دل اور روح کے تابع ہو کر، فطرت سے ہمہ آہنگ ہو جاتی ہے، جس سے فطری اور روحانی صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں اور نفس مطمئنہ کے اجزاء حاصل ہوتے ہیں، نیز زندگی اسلامی تعلیمات سے ہمہ آہنگ ہونے لگتی ہے۔

لیکن خیالات کی حالت کچھ اس طرح ہوئی ہے کہ خواہشات پر مبنی خیالات از خود آنے لگتے ہیں، ان کے لئے محنت کرنی نہیں پڑتی، نیز مادہ پرستی پر مبنی خیالات و مناظر سے منفی خیالی قوت غالب ہونے لگتی ہے، یعنی خیالات کو محنت کر کے مثبت رنگ نہ دینے کے وجہ سے خیالات کی یہ دنیا از خود خواہشات کے غلبہ کی صورت اختیار کرنے لگتی ہے جب کہ پاکیزہ خیالی قوت کے غلبہ کے لئے منفی خیالی قوت کے پس پردہ کارفرما نفس پرستی کی قوتوں سے شدید معرکہ آرائی کرنی پڑتی ہے، اس معرکہ آرائی کے بغیر پاکیزہ خیالی قوت کا غلبہ ناممکن ہوتا ہے، اس صورت میں اچھا انسان بن کر متقی انسان بننے کی راہ دشوار تر ہوتی ہے۔

ہر فرد کو خیالات کی شدید کشمکش سے دوچار ہونا پڑتا ہے، بالخصوص موجودہ دور میں جب کہ معاشرہ پر منفی خیالی قوت غالب ہے، اس دور میں یہ کشمکش تیز تر ہو گئی ہے، خیالات کی اس تیز تر کشمکش کے دور میں خیالات کو پاکیزہ بنانے کے لئے غیر معمولی محنت سے کام لئے بغیر چارہ کار نہیں، ورنہ فرد منفی خیالات کے غلبہ کے زیر اثر سیرت و کردار کے بحران سے دوچار ہو گا اور اس کے لئے اپنے آپ کو حد تجاوز ہیں رکھنا دشوار تر ہو گا۔

اس بات کو بھی سمجھنا ضروری ہے کہ انسان کو دنیا میں زبردست آزمائش کی حالت میں رکھا گیا ہے، وہ آزمائش یہ ہے کہ سارے معبودوں کی نفی کر کے، اللہ واحد کو اپنا حقیقی معبود بنا کر اس کی عبادت اور اطاعت کو مقصود زندگی بنایا جائے۔

اس مقصد کی راہ میں نفس پرستی کی قوتیں غیر معمولی طور پر حائل ہیں، وہ کوشاں ہوتی ہیں کہ فرد اس راہ پر گامزن نہ ہونے پائے۔

نفس پرستی کی یہ قوتیں دراصل خیالات اور تصور کی قوت کو آلہ کار بنا کر ہی شخصیت پر حاوی ہو جاتی ہیں، ہر وقت مادیت کی فکر، ہر وقت مستقبل کی فکر، ہر وقت دولت کی فکر، ہر وقت مادی دنیا میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی فکر، ہر وقت اندر سے حرص و ہوس کے

جذبات کا امنڈتے رہنا، ہر وقت کسی نہ کسی مادی خیال میں مگن رہنا وغیرہ، یہ ساری چیزیں نفس پرستی ہی کی صورت ہوتی ہیں۔

فرد جب مثبت خیالی قوت کے ذریعہ نفس پرستی کی ان قوتوں سے مقابلہ کی راہ پر گامزن ہونے لگتا ہے تو اسے نفس کی آلہ کار منفی خیالی قوت سے قدم قدم پر ٹکراؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے، منفی خیالی قوت آسانی سے جان چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتی، اس سے شدید معرکہ آرائی کرنی پڑتی ہے، یہ معرکہ آرائی پاکیزہ خیالی قوتوں کو خدا پرستی کے مرکزی نکتہ پر مرتکز کرنے کی صورت میں ہوتی ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس ٹکراؤ کے دوران نفس کی قوت کے ساتھ مادہ پرستی کی قوتیں اور شیطان کی قوت بھی شامل ہو جاتی ہیں، یہ ساری قوتیں مل کر خیالات کی حرکت کو تیز تر کر دیتی ہیں اور فرد کو روزمرہ زندگی میں شدید الجھاؤ سے دوچار کر دیتی ہیں۔

اس لئے اس راہ پر چلنے کے لئے ہمت اور حوصلہ کے ساتھ ساتھ نفس پر قابو یافتہ شخصیت کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے، تا کہ اس کشمکش میں مبتلا فرد کی وہ وقتاً فوقتاً رہنمائی کر سکے، اور اسے بتا سکے کہ اس راہ میں اسے کیا کیا دشواریاں درپیش ہو سکتی ہیں، اور ان دشواریوں سے بچاؤ کے سلسلے میں کیا کیا چیزیں اس کی معاون و مددگار ہو سکتی ہیں۔

پاکیزہ خیالی قوت کی راہ پر گامزن فرد کو جہاں نفس، شیطان اور مادہ پرستی قوتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہاں اس کے ساتھ قدم قدم پر اللہ کی معیت بھی شامل ہونا شروع ہو جاتی ہے، پھر اندر سے روحانی اور وجدانی داعیے بھی اپنا کام کرنے لگتے ہیں، جس سے اس راہ پر چلنے والا فرد احساس تنہائی کا شکار ہر گز نہیں ہو پاتا، اور وہ خوشی خوشی سے یہ راہ طے کرنے لگتا ہے، اس محنت جد و جہد کا حاصل پاکیزہ خیالی قوت کے غلبہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جہاں دنیا میں رہتے ہوئے بھی فرد دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اللہ کی محبت اس کی شخصیت کا احاطہ کرنے لگتی ہے، آخرت کی فکر اس پر غالب ہونے لگتی ہے، انسانیت کی فکر اسے ستانے لگتی ہے کہ کاش ایسی صورت پیدا ہو، جس سے انسانیت کو پاکیزہ خطوط کی راہ پر گامزن کیا جا سکے۔

محمد موسیٰ بھٹو

خیالات میں پاکیزگی کیسے پیدا ہو؟

ہر فرد کو درپیش بحران کا تجزیہ

خیالات ایسے ہیں جو ہر وقت آتے رہتے ہیں، انہیں روکنے کی کوشش کے باوجود وہ رکنے نہیں پاتے، اور المناک بات یہ ہے کہ اکثر خیالات منفی نوعیت کے ہوتے ہیں، اور یہ منفی خیالات دکھ، اذیت اور غم کے احساسات سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔

روزمرہ زندگی میں ہمیں جو حالات اور جو واقعات پیش آتے ہیں، یا جن چیزوں کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو سوچ کو متاثر کرتی ہیں، اور ذہن انہی چیزوں کے گرد گھومنے لگتا ہے، فرد چاہتا ہے کہ منفی خیالات جس سے ذہن منتشر ہو، وہ نہ آنے پائیں، لیکن ایسا نہیں ہوتا، اور خیالات آ کر فرد کے فکری انتشار میں اضافہ کرتے رہتے ہیں، انہی خیالات سے ذہنی دباؤ بڑھتا ہے اور فرد حالت اشتعال میں متعلقہ افراد کو نقصان پہنچانے کے لئے کوشاں ہونے لگتا ہے۔

خیالات کے اسی ہجوم سے ہر شخص پریشان ہے اور وہ زبانِ حال سے پوچھنے لگتا ہے کہ کیا خیالات کے انتشار سے بچ کر انہیں پاکیزہ صورت دی سکتی ہے، جس سے طبیعت میں ٹھہراؤ پیدا ہو اور ذہن جیسی ہر وقت متغیر ہونے والی قوت پر قابو پایا جا سکے یا اسے مثبت سوچ کی طرف لایا جا سکے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ایسا ہونا ممکن ہے، لیکن اس کے لئے وقت دینا ہوتا ہے اور جد و جہد سے کام لینا پڑتا ہے، دنیا میں ہر کام میں استعداد حاصل کرنے کے لئے وقت دیئے بغیر چارہ کار نہیں ہوتا، فرد روزی کے لئے بھی آٹھ دس گھنٹے صرف کر دیتا ہے، خیالات جو فرد کی

شخصیت اور اس کی زندگی میں تہلکہ برپا کر دینے کا ذریعہ بنتے ہیں، ان کو حالتِ اعتدال میں رکھنے کے لئے بھی مجاہدوں (کاوشوں) کے بغیر کام نہیں چلتا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس کی صورت کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ تفکر سے کام لیا جائے اور اس کے لئے روزانہ کچھ نہ کچھ وقت نکالا جائے، تفکر میں ذہن اور دل کو کسی مرکزی نکتہ پر لانا پڑتا ہے، یہ مرکزی نکتہ اللہ کے اسم ذات کا استحضار ہونا چاہئے، اگرچہ شروع میں ایسا کرنے سے بہت ساری مشکلات پیدا ہوں گی، وسوسوں کا گھیراؤ ہوگا، نفس کی قوتیں مشتعل ہو کر فرد کا گھیراؤ کریں گی، لیکن نفس کی قوت کا مقابلہ کر کے بھی روزانہ تھوڑی دیر کے لئے تفکر سے کام لیتے رہنے کی مشق کرنا ناگزیر ہے، اگر فرد نے حوصلے اور ہمت سے چند ماہ تک ایسا کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تو اس سے رفتہ رفتہ تفکر کی استعداد میں اضافہ ہوتا رہے گا یہاں تک ایسا آئے گا کہ تفکر مزاج کا حصہ بن جائے گا اور روزمرہ زندگی کے حالات، واقعات اور مزاج کے خلاف ہونے والی باتوں کے اثرات ذہن کو منتشر کرنے کا باعث نہیں بن سکیں گی۔

تفکر کے نتیجے میں یہ بہت بڑی کامیابی شمار ہوگی، جو فرد کو حاصل ہوگی، تفکر سے نہ صرف ذہن صحتمند رخ اختیار کرنے لگتا ہے اور خیالات کی طوفانی لہریں رک جاتی ہیں، بلکہ تفکر سے دل سے نکلنے والے جذبات واحساسات میں بھی پاکیزگی آنے لگتی ہے، نیز نفس کی حالت میں بھی تغیر برپا ہونے لگتا ہے کہ وہ امارہ سے لوامہ کے مراحل طے کر کے مطمئنہ کے ابتدائی مرحلے میں داخل ہونے لگتا ہے۔

یہ کتنی بڑی کامیابی ہے جو تفکر کے نتیجے میں فرد کو حاصل ہوتی ہے۔

یہ ہماری محرومی ہے کہ ہمہ محض حوصلے کی کمی کی وجہ سے تفکر کے اتنے فوائد و ثمرات سے محروم ہیں اور ہم خیالی قوتوں کے ہاتھوں عدم ذہنی توازن کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔

یاد رکھیں کہ نفس مکر وفریب اور دوسروں کے خلاف سازشوں کے جوتانے بانتا رہتا ہے، ذہن اس کا ساتھی بن کر اس کی ان سازشوں میں حصہ دار اور معاون بنتا ہے، ذہن تفکر کی قوت کے ذریعہ اگر ان معاملات میں نفس کا ساتھ دینے سے انکار

کرے تو نفس بے بس ہو کر سازشوں کے جال بننے سے باز آنے لگتا ہے، دوسری صورت میں ذہن نفس کی قوت سے مل جاتا ہے تو نہ صرف یہ کہ فرد کی شخصیت سخت ذہنی کشیدگی، تناؤ اور بحران سے دوچار ہونے لگتی ہے، بلکہ ذہن اور نفس کے اس بگاڑ سے معاشرہ بھی فساد سے دوچار ہونے لگتا ہے۔

ذہن کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنے دوست واحباب کی طرف سے مزاج کے خلاف ہونے والی باتوں کا سخت اثر لیتا ہے، اس طرح کے مواقع پر ذہن، نفس کی اسکرپٹ پر اپنے ہی فرد کے خلاف منفی قسم کی سوچ میں مصروف رہنے لگتا ہے، ذہن آئے دن اس طرح کی واردات کا مرکز بن جاتا ہے، اس طرح ذہن تاریکی کی قوتوں کا ہمنوا بن کر ظلمات کا شکار ہونے لگتا ہے۔

ذہن کو اس طرح کی خطرناک منفی سوچ سے بچانے کے لئے بھی تفکر سے کام لینے کی ضرورت ہے، تاکہ مثبت اور پاکیزہ شعاعیں ذہن کی طرف منتقل ہوتی رہیں۔

اسلام میں عبادات اور مسنون اذکار کا سلسلہ ایسا ہے، جس سے ذہن کے ساتھ ساتھ ساری شخصیت صحتمند خطوط پر گامزن ہونے لگتی ہے، اور ذہنی بگاڑ سے بچاؤ کی مؤثر صورت پیدا ہونے لگتی ہے، لیکن چونکہ عبادات اور مسنون اذکار سے منفی ماحول موجود نہیں ہے، اس لئے ہم نے تفکر کی راہ پر زور دیا ہے، اس تفکر سے بھی عبادت و مسنون اذکار سے رفتہ رفتہ مثبت ماحول پیدا ہونے لگتی ہے اور اسلام کو مطلوب انسان کی تیاری میں مدد ملتی ہے۔

اسلام، دعوتی کام اور دوسروں کی اصلاح پر بھی زور دیتا ہے، لیکن جو فرد خود فکری انتشار اور ذہنی الجھنوں کا شکار ہو، اس کے لئے دعوتی کام کرنا نہ صرف محال ہے، بلکہ وہ اس طریقے سے دوسروں کے فکری انتشار پیدا کرنے کا ذریعہ بنے گا، اس لئے پہلے اپنے آپ کو ذہنی طور پر متوازن بنانا اور مستحکم کرنا انتہائی ضروری ہے بلکہ حد یہ کام ہو جائے تو اس کے بعد دعوتی کام کا ہونا انتہائی ناگزیر ہے ہم، دوسری صورت میں نہ تو اسلام کے تقاضے پورے ہوں گے اور نہ ہی معاشرے کو نفس پرستی اور فکری انتشار سے بچایا جا سکتا ہے۔

مختار مسعود

زوال وانتشارِ تہذیب

میں خواب سے بیدار ہوا اور حقیقت کی سنگلاخ دنیا میں واپس آگیا۔ اس کے بدلتے ہوئے رویّے پر غور کیا تو نئے نئے انکشاف ہونے لگے۔

یہ رات جاگ کر گزاری تو اس رات آزادی کی نعمت ہمارے حصے میں آئی، یہ اگست ۱۹۴۷ء کی بات ہے یہ رات سو کر اٹھے تو دنیا ہی بدلی ہوئی پائی۔ مجلس قانون کو لاقانون قرار دیا جا چکا تھا اور آئین سے وفاداری کی حلف اٹھانے والے اسے منسوخ کر چکے تھے، یہ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی بات ہے۔ اس کے بعد ہر بلا خانۂ انوری پر نازل ہونے لگی اور برق نے بے چارے مسلمانوں پر گرنا سیکھ لیا۔ ہم نے لاکھ تقریریں کیں، خوش خیال اور دھواں دھار، مگر تاریخ نے ہماری یہ نہ سنی۔ ہم نے بڑے بڑے منصوبے تیار کیے۔ دنیا نے ان کی تعریف بھی کی، مگر تاریخ نے ہماری یہ بھی نہ چلنے دی۔ تاریخ نے اپنا رشتہ ہمارے اعمال کے ساتھ استوار کر لیا اور یہ دن ہمیں پایہ جولاں ڈھاکہ ریس کورس میں لا کھڑا کیا، یہ دسمبر ۱۹۷۱ء کی بات ہے۔ اس روز ہم نے مڑ کر اپنی تاریخ پر نظر ڈالی تو ہمیں یاد آیا کہ تاریخ کو کسی تاریخ داں نے جرائم، حماقتوں اور بدقسمتی کی فہرست کہا ہے۔ اگر ہماری تاریخ میں ۲۳ مارچ اور ۱۴ اگست کے دن نہ ہوتے تو ہم تاریخ کی اس تعریف پر ایمان لے آتے۔

ہمارا شاعر یہ کہتا ہے کہ اہل ایمان جہاں میں خورشید کے مانند جیتے ہیں، اگر ادھر ڈوب گئے تو اُدھر نکل آئے۔ ان میں سب کمزوریاں ہیں، سوائے ڈوب جانے کے۔ ہمارا فلسفی یہ کہتا ہے کہ تاریخ کے ہر نازک مرحلے پر اسلام نے مسلمانوں کو بچایا ہے، نہ کہ مسلمانوں نے اسلام کو۔

اپنے شاعر فلسفی کی رائے کی روشنی میں مجھے تاریخ کی نئی تعریف اور فلسفۂ تاریخ کی نئی تشریح کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مجھے ایسا مورخ ملا جو تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق میں اس شاعری کی تلاش کرتا ہے جو ذاکو پہچاننے میں مدد دیتی ہے۔ اس کی نظر میں انسان وہ چوبِ خشک ہے جس سے ہر دم آواز دوست آتی ہے اور جو ذات ہے جس سے انسان کو اس کا شرف اور شعور ملتا ہے۔ زندگی کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس مہلت میں انسان جو ذات سے اپنا تعلق قائم کر لے۔ تلاشِ حق میں انسان کی ساری صلاحیتیں حد کمال تک پہنچ جاتی ہیں اور روح انتہائی بلندیوں کو چھو لیتی ہے۔ جہاں کمال اور بلندی دونوں جمع ہو جائیں، وہاں تاریخ انسان کی تہہ میں چھپی ہوئی شاعری ہے ایسے احساس میں بدل جاتی ہے جو صرف ذات عزوجل اور بزرگ وبرتر کے حضور پیدا ہوتا ہے۔

یہ رائے اُس انگریز مورخ کی ہے جس نے اپنی طویل اور سلسلہ وار کتاب کا اختتام ایک طویل اور سلسلہ وار دعائیے پر کیا ہے۔ یہ دعا بر گزیدہ ہستیوں سے خطاب کی صورت میں ہے۔ مولانا روم کو مخاطب کیا اور کہا: اے موسیقی سے لبریز نے! وہ نغمہ فردوس سنا جو اس نفس سے پیدا ہوتا ہے جو ذات نے تجھ میں پھونکا ہے۔ اس دعا میں رسول اللہ ﷺ سے شفاعت کی درخواست کی ہے، تاکہ کمزور و ناتواں انسان کو اپنی ناطاقتی سے بلند ہو کر حق کی حد میں کا موقع مل سکے۔ دعا کا یہ سلسلہ قرآن مجید کی اس آیت پر تمام ہوتا ہے: (الی اللہ) (ہم سب کو بالآخر اسی کی طرف لوٹ جانا ہے)۔ یہ سارے حوالے دیکھنے کے بعد کسی نے تعجب سے پوچھا کہ آلڈس ہکسلے ٹائن بی "لاالہ" کی پہلی منزل سے گزرے بغیر "انا للہ" کی آخری منزل تک کیوں کر پہنچ گیا؟!

ٹائن بی کی اہمیت اس کی شہرت سے زیادہ ہے، مگر یہ اہمیت اور شہرت دونوں اس کی کتاب "تاریخ کا مطالعہ" پر مبنی ہیں۔ اس کتاب کا موضوع کسی عہد یا علاقے کی تاریخ نہیں، بلکہ تاریخ عالم اور تاریخ انسانی کا ایسا جائزہ ہے جس کی رو سے ایک نیا فلسفہ تاریخ قائم

ہوتا ہے۔ٹائن بی کے فلسفہ تاریخ کا حاصل یہ ہے کہ تاریخ کے مطالعے کے لیے موزوں اکائی نہ ملکوں کی غیر مستقل سرحدیں ہیں، نہ ان کی عارضی حکمرانیاں، بلکہ تہذیب یا معاشرہ ہے۔ ٹائن بی کا کہنا ہے کہ پانچ تہذیبیں پیدا ہوئیں، مگر بن کھلے مرجھا گئیں۔ اکیس تہذیبیں ترقی کے مختلف مدارج پہنچیں اور انہی میں سے دو اتنی دور پھیل گئی کہ ان کی دو مثالیں بجائے خود تہذیب کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ ان اکیاون تہذیبوں میں سے بیشتر گزشتہ سے پیوستہ ہیں اور صرف چھ براہ راست ایام جاہلیت سے پیدا ہوئیں۔

تہذیب کے ابتدا کے بارے میں ٹائن بی نے نظریہ مجاہدہ پیش کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مشکلات سے مقابلہ کرتے ہوئے کوئی معاشرہ فتح حاصل کرتا ہے تو تہذیب کی داغ بیل پڑ جاتی ہے۔ مشکلات جغرافیائی ہو سکتی ہیں، مثلاً: تکلیف دہ آب وہوا۔ تاریخی ہو سکتی ہیں، مثلاً: غلامی حملے یا سرحدوں پر دباؤ۔

تہذیب کا ارتقا طباع افراد کی اقلیت کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ یہ لوگ پہلے راستہ ڈھونڈتے یا تراشتے ہیں اور پھر اکثریت ان کی پیروی میں اس راہ پر چل نکلتی ہے۔ تلاش راہ کے دوران طباع افراد کو تنہا یا ان پر مشتمل اقلیت کو رخصت اور مراجعت کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ سینٹ پال، سینٹ گریگوری، مہاتما بدھ، میکاولی، دانتے اور کتنے ہی ایسے طباع افراد پر وہی بات صادق آئی جو افلاطون نے کسی غار میں رہنے والوں کے بارے میں کہی تھی۔ اگر غار میں رہنے والوں نے کبھی روشنی نہ دیکھی ہو اور کبھی آدمی باہر نکل آئے تو پہلے اسے روشنی کی ماہیت سمجھنے میں کچھ وقت لگے گا اور پھر وہ واپس جا کر اس نور کا ذکر ساتھیوں سے کرے گا تو وہ سب اس پر ہنسیں گے اور موقع ملے تو جان سے مار ڈالیں گے۔ طباع اقلیتوں پر بھی تجربے کی یہی دو کیفیتیں گزرتی ہیں کہ وہ عام روش سے ہٹ کر کچھ وقت نور کی دریافت میں صرف کرتی ہیں، پھر واپس آ کر اکثریت کو ساتھ چلنے کی دعوت دیتی ہیں۔ جہاں اکثریت نے طباع افراد یا اقلیت کی پیروی کا صحیح حق ادا کیا، وہاں تہذیب ترقی پذیر رہتی ہے۔ بحث کو

اس نقطے پر پہنچا کر ٹائن بی نے زوال وانتشار تہذیب پر اپنی تحقیق اور اپنے نظریے کو پیش کیا ہے۔

میں تو ٹائن بی کے پاس تہذیب کی بنیاد، نشوونما اور ارتقا کی داستان سمجھنے گیا تھا، اس نے اسے مختصر کیا اور زوال وانتشار کی بات لے بیٹھا۔ پہلے تو مجھے یہ مطالعہ عجیب اور غیر ضروری معلوم ہوا، مگر اب اس کے بارے میں رائے بدل چکا ہوں۔ نئی بنیادیں وہی لوگ بھر سکتے ہیں جو اس راز سے واقف ہوں کہ پرانی بنیادیں کیوں بیٹھ گئیں!

محمد زکریا نعمانی

اولڈ ہومز میں آنسو بہاتی مائیں

۱۹۵۶ء میں امریکی حکومت نے پینسٹھ سال سے زائدالعمر محتاج اور ضرورتمند لوگوں کی دیکھ بھال کے لئے (Medicare) نامی ایک ادارہ قائم کیا تھا، جس میں مختلف بوڑھے اور ضرورتمند لوگوں کو رکھ کر ان کی ضرورتیں پوری کی جاتی تھیں، رفتہ رفتہ اس ادارے سے مختلف شعبے بنتے رہے، ان میں سے ایک شعبہ (Old Age care home) کے نام سے ہے، جہاں بے گھر بڑی عمر کے لوگوں کو مختلف سہولیات فراہم کی جاتی ہے۔

مغربی معاشرے میں خاندان کا تصور فنا ہو چکا ہے، وہاں ہر کوئی (Privacy) چاہتا ہے، تنہا اور الگ رہنے کو ترجیح دی جاتی ہے اور الگ رہنے میں کوئی کوفت اور تکلیف بھی محسوس نہیں ہوتی کیونکہ وہاں کا ماحول ہی تنہائی پسندی کا ہے۔ لہٰذا اولاد کی شادی کے بعد بہت سارے ماں باپ اولڈ ہاؤس منتقل ہو جاتے ہیں، جن کے لئے وہاں مقامی حکومت کی طرف سے ہر طرح کی سہولیات میسر ہوتی ہیں۔

مغرب کی نقالی کرتے ہوئے پاکستان میں بھی اولڈ ہومز بننا شروع ہو چکے ہیں، اس وقت پاکستان کے مختلف شہروں میں تقریبا تیس اولڈ ہومز بنے ہوئے ہیں، یہ سارے اولڈ ہومز پرائیویٹ ہیں، حکومت کی طرف سے ان کی خاطر خواہ مدد نہیں کی جاتی، مختلف ادارے اپنی مدد آپ کے تحت اولڈ ہومز چلا رہے ہیں، اور بعض صاحب حیثیت لوگ ان کی مدد کرتے ہیں۔

پاکستان اور دیگر مسلم معاشروں میں خاندانی تصور بحمد اللہ بہت مضبوط ہوتا ہے، ماں باپ مرتے دم تک اپنی اولاد کے ساتھ رہنے کو ترجیح دیتے ہیں اور ان کے سامنے ہی اپنی پوری

زندگی گذارتے ہیں، اپنے پوتے پوتیوں کو نظروں کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں، ہمیشہ اپنے گھر میں ہی رہنا چاہتے ہیں، لیکن بعض اوقات ناخلف اور نافرمان اولاد مغرب کی پیروی کرتے ہوئے اپنے والدین کو اولڈ ہومز میں چھوڑ آتی ہے، اولڈ ہومز میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہے، جن میں اچھی خاصی شرح بوڑھی ماؤں کی بھی ہے۔

ماں بچے کو پیٹ میں رکھ کر نو مہینے تکلیفیں برداشت کرتی ہے، جبکہ پیدائش کے وقت اسے زندگی اور موت کی کشمکش سے گذرنا پڑتا ہے، کئی مائیں تکلیف کی شدت سے دنیا چھوڑ جاتی ہیں، اتنی پریشانیوں کے بعد بچہ پیدا ہوتا ہے اور بچے پر صرف ایک نظر پڑتے ہی ماں اپنے سارے دکھ درد بھول جاتی ہے، پھر اسے سال دو سال تک دودھ پلاتی ہے۔

سردیوں کی راتوں میں ماں خود ٹھنڈی جگہ سوتی ہے اور اپنے جگر گوشے کو گرم جگہ سلاتی ہے، راتوں کی نیند قربان کرتی ہے، خود ٹھنڈ سے کپکپاتی ہے اور اپنے بچے کو گرم لحاف میں سلاتی ہے، بچے کو راحت پہنچانے کے لئے ہر طرح کے جتن کرتی ہے۔

جوانی میں جب بچہ گھر سے باہر جاتا ہے، واپس آنے تک ماں اس کے لئے دعائیں کرتی رہتی ہے، اگر بچہ گھر واپس آنے میں کچھ تاخیر کردے تو ماں کا دل بے قرار ہو جاتا ہے، اس کی نظریں دروازے کی طرف لگی رہتی ہیں جب بچہ گھر لوٹتا ہے تو اسے آغوش میں لیکر اپنی محبت کا اظہار کرتی ہے۔ امتحانوں اور انٹرویوز سے پہلے ماں اپنے بچے کے لئے گڑگڑا کر دعائیں مانگتی ہے، اپنے بچے کی کامیابی کے لئے منتیں مانتی ہے، اب بچہ کامیاب ہو جاتا ہے تو اسے دنیا بھر کی ساری خوشیاں حاصل ہو جاتی ہیں۔

ایک وقت آتا ہے جب ماں کی آنکھوں کا تارا خود بھی صاحب اولاد ہو جاتا ہے، ماں دادی بن جاتی ہے، دادی کو اپنے پوتوں سے بھی پیار ہوتا ہے، ان کے ساتھ کھیل کر اپنا دل بہلاتی ہے، البتہ بیٹے کو ماں سے زیادہ پیار اپنے بچوں سے ہو جاتا ہے، یہاں سے اُس کے رویے میں تغیر شروع ہو جاتا ہے، ماں کی محبت کم ہوتی چلی جاتی ہے، رفتہ رفتہ اسے ماں بوجھ لگنے لگتی ہے،

اسے سکون اپنے بچوں کو دیکھ کر آتا ہے، ماں کی طرف دیکھ کر اسے کس طرح سے گھٹن سی محسوس ہوتی ہے، پھر رہی سہی کسر اس کی بیوی پوری کر دیتی ہے، جو آئے دن اپنی ساس کی مختلف شکایات اپنے شوہر سے کرتی رہتی ہے، کبھی کھانسنے کی شکایت، کبھی زیادہ بیماری کی شکایت، کبھی اس سے بدتمیزی کی شکایت، بیٹا روز روز یہ شکایتیں سن کر بیزار ہو جاتا ہے، اور بے رحم، سنگدل، نافرمان اور احسان فراموش بیٹا ایک دن اپنی ماں کو رشتہ داروں کے گھر کا بہانہ بنا کر اولڈ ہوم چھوڑ آتا ہے۔

بوڑھی ماں اولڈ ہوم میں اکیلی رہ جاتی ہے، وہ ماں جسے اپنے بیٹے سے بہت پیار تھا، بیٹا اس کا سب کچھ تھا، وہی اس کی کل کائنات تھا، وہ اسے اولڈ ہوم میں چھوڑ کر چلا جاتا ہے، بوڑھی ماں کبھی اپنی اولاد کو یاد کر کے آنسو بہاتی ہے، کبھی اپنے پوتوں کو یاد کر کے رونے لگتی ہے، کبھی بہو کی ستم ظریفی کو یاد کر کے سسکیاں بھرتی ہے اور اسی رنج و غم میں زندگی کے باقی دن سسک سسک کر گزار دیتی ہے۔

دنیا کے مختلف ممالک میں جو اولڈ ہومز بنے ہوئے ہیں، وہاں پس پردہ ان ہی حالات کی کارفرمائی ہے، مغربی ممالک میں اولڈ ہومز کا تصور بہت زیادہ ہے، اور وہاں ماں باپ کو اولڈ ہومز میں چھوڑ دینا معمول کی بات ہے، البتہ پاکستان میں ماضی قریب تک اس کا تصور بہت کم تھا، لیکن حالیہ عرصے میں والدین کو اولڈ ہومز میں چھوڑنے کی شرح میں اضافہ ہو گیا ہے، اور مختلف حیلے بہانوں سے ان کو اولڈ ہومز کے حوالے کیا جا رہا ہے، بیٹے یہ نہیں سوچتے کہ آج وہ اپنے ماں باپ کو اولڈ ہومز کے حوالے کر رہے ہیں، کل ان کے بیٹے بھی انہیں اولڈ ہومز کے حوالے کریں گے، اسی طرح بہو اپنی ساس کی ذرا ذرا سی بات کو بڑھا چڑھا کر اپنے شوہر کے سامنے پیش کرتی ہے، کل وہ خود بھی اپنی بہو کی ساس بنے گی، آج اپنی ساس کے ساتھ جو معاملہ کرے گی، کل اس کی بہو بھی اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرے گی، یہ سب مکافاۃ عمل ہے یعنی آج جو بوئے گا وہ کل کو کاٹے گا بھی۔

دین اسلام نے والدین کے حقوق بہت تاکید اور اہتمام سے بیان کئے ہیں، قرآن مجید میں انسانوں کو والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے، وجہ اس کی یہ بیان کی گئی ہے کہ **حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا** (سورۃ الاحقاف آیت ۵۱) یعنی ماں نے حمل کے وقت بھی تکلیفیں برداشت کیں اور زچگی کے دوران بھی بہت تکلیفیں اٹھائیں۔

لہٰذا تمہیں اتنی تکلیفوں کے بعد پالا پوسا تو تم ان تکلیفوں کو یاد کر کے اپنی ماں کو مت ستاؤ اور ہمیشہ ان کا خیال رکھو۔

حدیث نبوی کا مضمون ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا: (اللہ کے رسول! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: تمہاری ماں۔ اس نے کہا: اس کے بعد؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہاری ماں۔ اس نے کہا: اس کے بعد؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: تمہاری ماں۔ اس نے کہا: اس کے بعد؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارا والد اس حدیث کو امام بخاری اور امام مسلم نے بیان کیا ہے۔ (بخاری: ۶۲۶۵ مسلم: ۸۴۵۲)

اس حدیث کے اندر ماں کا حق تین مرتبہ بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد باپ کا حق بیان کیا گیا ہے، یعنی حقوق کے معاملے میں ماں کا مرتبہ باپ سے بھی پہلے آتا ہے، باپ چونکہ طاقتور ہوتا ہے، اس لئے بہت سارے مواقع میں وہ اپنے حقوق خود بھی حاصل کر سکتا ہے اور والدہ چونکہ کمزور ہوتی ہے وہ اپنا حق خود حاصل نہیں کر سکتی لہٰذا ماں کے ساتھ زیادہ شفقت اور مہربانی کا حکم دیا گیا ہے۔

ماں باپ کی عظمت سے متعلق ایک اور حدیث مبارک ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور جہاد کے لئے اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: (کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟) تو اس نے

کہا: جی ہاں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ان دونوں کی خدمت کر کے جہاد کا درجہ حاصل کرو۔
(بخاری ۲۴۸۲ مسلم ۲۵۴۹)

اس حدیث کے اندر ماں باپ کے ہوتے ہوئے اس شخص کو جہاد کے بجائے ماں باپ کی خدمت کرنے کا حکم دیا جارہا ہے۔ کیونکہ جہاد کے لئے دوسرے مسلمان بھی جا سکتے ہیں لیکن ماں باپ کی جو خدمت اولاد کر سکتی ہے کوئی اور نہیں کر سکتا۔

ایسی سنگدل اور بے رحم اولاد جو اپنے ماں باپ کو اولڈ ہومز کے حوالے کرتی ہے اُسے اپنی آخرت کی فکر کرنی چاہئے قرآن مجید میں ہے، فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ تم انہیں اف تک نہ کہو۔

اولڈ ہوم میں پہنچ کر تو والدین کے آنسو نہیں رکتے، ان کا دل غم سے بھرا ہوا ہوتا ہے، انتہائی بے بسی اور بے کسی کے عالم میں جب اسے اپنے فرزند یاد کرتے ہیں تو ان کی آہ کیوں نہ لگے گی، ایسے لوگ دنیا میں بھی عبرت کا نشان بنتے ہیں اور آخرت میں بھی ان کا انجام بہت بُرا ہوتا ہے۔ والعیاذ باللہ، اللہ تعالیٰ ہم سب کو والدین کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے اور ان کی عزت وتکریم کے شرف سے نوازے۔ آمین۔

محمد عامل عثمانی

بھگت سنگھ سے محمد شکیل تک کا سفر
فلمی ستاروں سے ملنے کے لئے جانے والا
اسلام کے نور سے منور ہو گیا

یہاں ایک محفل میں ایک غیر معروف شخص کا بیان تھا۔ بعد ازاں میں نے ان کا تعارف جاننا چاہا تو ساتھیوں نے کہا کہ یہ نو مسلم ہیں، بہتر ہے کہ یہ خود ہی اپنا تعارف کرادیں گے۔ انہوں نے راقم کو بتانا شروع کیا کہ میرا نام بھگت سنگھ تھا، میں دلی کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوا، ابتدائی تعلیم اپنے علاقے سے ہی حاصل کی اور پولیس میں بھرتی ہو گیا۔ الحمدللہ ہماری زمین وجائیداد بھی بہت تھی، جس سے بہت اچھے طریقے سے گھر چل رہا تھا۔ اچانک میری زندگی میں ایک ایسا دلفریب حادثہ پیش آیا، جس نے میری کایا ہی پلٹ دی۔ میرا ایک دوست جو کہ دلی میں فلمی ڈائریکٹر تھا اور فلم اسٹار دھرمندر سے اس کی اچھی جان پہچان تھی۔ جب مجھے پتا چلا تو میں نے اپنے دوست سے درخواست کی کہ مجھے دھرمندر جی سے ملوا دے، اس نے کہا آپ آجاو ملوا دیتے ہیں، میں نے خوشی خوشی سامان پیک کیا، مہنگے ترین سوٹ خریدے کیونکہ فلم اسٹار سے ملنے جارہے ہیں ٹکٹ لینے پہنچا تو کیا دیکھا کہ میرے محلے کے کچھ مسلمان دوست وہاں موجود ہیں اور ٹکٹ خرید رہے ہیں، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ بھی دلی جارہے ہیں، اپنے تبلیغی دورے پر، مجھے اچھا لگا کہ چلو ساتھ مل گیا، اپنے محلے کے لوگوں کا، جب ہم دلی پہنچے جونا بھٹی تبلیغی مرکز میں تورات کا وقت تھا، ساتھیوں نے کہا صبح سویرے چلے جانا رات یہیں گزار لو، میں نے سوچا اچھا ہے مسجد میں رات گزارنے میں کوئی حرج نہیں، ان

کی محبت میں وہیں بیٹھ گیا کہ صاحب بیان کر رہے تھے اللہ کی قدرت اور اس کی شان پر مجھے بڑا تعجب ہوا، ان کا بیان سن کر، وہ بیان میرے دل پر اثر کرنے لگا دوسرے دن بھی وہیں رک گیا، بیانات سنتا رہا، پھر تیسرے دن میں بدل ہی چکا، تھا میرے اندر کا بھگت سنگھ کہیں دفن ہو چکا تھا اور مجھ پر یہ راز کھلا کہ اسلام تو امن پسند مذہب ہے، اسلام تو بھائی چارے کا سبق دیتا ہے، جبکہ ہمارے گھرانوں میں اسلام کی کچھ اور ہی تصویر پیش کی جاتی تھی۔ اللہ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے ہدایت دے دی تھی اور یوں میں مسلمان ہو گیا اور میرا نام بھگت سنگھ سے بدل کر محمد شکیل رکھ دیا گیا پھر میں ان ہی کے ساتھ رک گیا۔

چالیس دن کے بعد گھر پہنچا تو میری داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور شلوار کرتہ زیب تن تھا، سب کو خبر ہو گئی کہ بھگت سنگھ تو مسلمان ہو گیا۔ سب مجھے ملنے آئے، مسلمان مجھے مبارکباد دینے آتے رہے اور میرے ہندو دوست مجھے کہتے کہ تم نے یہ کیا کر دیا، حتی کہ چیف منسٹر صاحب نے بھی کہا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟۔ اس سوال پر کہ اب آپ کا گزر بسر کیسے ہوتا ہے لوگوں نے تو آپ کا بائیکاٹ کر دیا ہو گا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ یقیناً بہت سی مزاحمتیں ہوتی رہیں، لیکن مجھ پر اللہ کا فضل ہے کہ میری تمام جائیداد پر کوئی حرف نہیں آیا اور خوب گزر بسر ہو رہی ہے۔ میرے بیوی بچے اور اکثر تقریباً خاندان والے بھی مسلمان ہو چکے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اب میری تمام زندگی کا مقصد غیر مسلموں کو اسلام کی صحیح اور سچی تصویر پیش کرنا ہے۔ غیر مسلم پیاسے بیٹھے ہیں، بس وہ منتظر رہتے ہیں کہ کوئی ہو، جو انہیں سیراب کرے یعنی دین اسلام کی پر امن تصویر پیش کرے۔ سعودی عرب کے بارے میں انہوں نے کہا کہ دل چاہتا رہتا ہے کہ بس حرمین شریفین آتا جاتا رہوں اور اللہ نے مجھے الحمدللہ آسانیاں دی ہوئی ہیں اور میں اکثر حاضری دیتا رہتا ہوں۔ محمد شکیل نے سعودی حکمرانوں کو ملک میں پر وقار ماحول اور امن امان کی مثبت تدابیر کرنے پر خراج تحسین پیش کیا۔

محمد موسیٰ بھٹو

باطنی بصیرت اور داخلی توانائی کا کام
اور اس کی فیصلہ کن اہمیت

فرد کو اسلام سے ہمہ آہنگ زندگی گزارنے کے لئے جہاں دین کی اہم تعلیمات کا ادراک حاصل ہونا ضروری ہے، وہاں باطنی بصیرت اور داخلی توانائی کی بھی ضرورت لاحق ہوتی ہے، باطنی بصیرت کے فقدان کی وجہ سے کبھی تو معاملات کے فہم کی صلاحیت بُری طرح متاثر ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ عمل کی استعداد کمزور ہو جاتی ہے، فرد جانتا تو بہت کچھ ہے لیکن عمل کے معاملہ میں وہ کوتاہ واقع ہوتا ہے۔

باطنی بصیرت ایمان و یقین کے استحکام اور متوجہ الی اللہ ہونے کے رسوخ سے پیدا ہوتی اور مستحکم ہوتی ہے، باطنی بصیرت سے ہی داخلی توانائی پیدا ہوتی ہے، جس کی وجہ سے فرد نفس کی قوتوں کو مطیع کر کے انہیں اسلام سے ہمہ آہنگ بنانے میں کامیاب ہوتا ہے۔

باطنی بصیرت عقلی فہم سے کئی گنا زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے، یہ کہنا بجا ہو گا کہ باطنی بصیرت کی مستحکم حالت بندہ مومن پر اللہ کا فیضان ہوتی ہے، جو اسے گناہوں سے متنبہ کر کے ان سے بچانے کا ذریعہ بھی بنتی ہے تو ساتھ ساتھ اعمال صالحہ بجالانے پر اکسانے کا سبب بھی۔

حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ اپنے اعمال کے بارے میں اپنے قلب سے فتویٰ پوچھا کرو، لوگوں کی رائے کو صحیح نہ سمجھا کرو۔

قلب کی بیداری کی حالت یا باطنی بصیرت دراصل اعمال پر چوکنا ہونے اور اعمال کو خالص اللہ کے لئے سرانجام دینے کے پہرے دار کا کردار ادا کرتی ہے۔

باطنی بصیرت فرد کو کس طرح سیدھا رکھنے کا ذریعہ بنتی ہے؟ اسے مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔

فرض کریں کسی سے حسد یا جلن کا مظاہرہ کر رہا ہوتا ہے، یا مال کی طمع و آرزو رکھنے لگتا ہے یا اپنے آپ کو دوسروں سے افضل سمجھ رہا ہوتا ہے، یا بظاہر کسی نیک عمل یا اعمال کو لوگوں کے دکھاوے کے لئے کر رہا ہوتا ہے، یا اپنے دوستوں اور جاننے والوں کی تنقیص کی خاطر ان پر تنقید کر رہا ہوتا ہے یا وقت ضایع کر رہا ہوتا ہے، یا سوشل میڈیا پر غیر ضروری پروگرام دیکھ رہا ہوتا ہے، یا اپنی اصلاح سے غافل ہوتا ہے تو اس طرح کے سارے مواقع پر قلبی بصیرت سامنے آتی ہے اور وہ فرد کو متنبہ کر کے اسے اس طرح کے گناہوں سے بچنے پر مجبور کرنے لگتی ہے، اور استغفار اور ذکر کی تجدید کر کے از سر نو صحیح سوچ اور صحیح اعمال کی راہ پر گامزن کرنے کا سبب بنتی ہے۔

لیکن قلبی بصیرت کی مستحکم حالت ایسی چیز ہے، جس کے لئے مجاہدوں کے ذریعہ متوجہ الی اللہ کے ملکہ کو راسخ کرنا پڑتا ہے۔

بندہ مومن قلب کی قوت سے غیر معمولی کارنامے سرانجام دیتا ہے، اپنے آپ کو دین پر مستحکم کرنے کا کام بھی تو ساتھ ساتھ جدید میں دین کے حوالے سے اپنی صلاحیتوں کے بھرپور استعمال کا کام بھی۔

قلب کی داخلی قوت کمزور ہوتی ہے تو قلب اول تو صحیح اور غلط کے درمیان فتویٰ دینے سے قاصر ہوتا ہے، دوم یہ کہ قلب کی اس کمزور حالت کی وجہ سے بالخصوص باطنی نوعیت کے گناہوں سے بچنا دشوار ہو جاتا ہے۔

دل کی اس فیصلہ کن اہمیت کی وجہ سے دل کو بنانے اور باطنی بصیرت پیدا کرنے کا انتہائی اہم کام ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ فرد بہت کچھ جاننے اور اہل علم ہونے کے باوجود حسد، بڑے پن، خود نمائی، دوسروں کی تنقیص اور وقت کے ضیاع سے بچنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔
سبب یہ ہوتا ہے کہ دل کی بصیرت اور دل کی توانائی کی حالت کمزور ہوتی ہے۔

فرد کو جہاں اس کے لئے ضروری علم کی ضرورت ہے، وہاں دل کو نفس کی گرفت سے آزادی دلا کر اس کی باطنی بصیرت اور داخلی قوت میں اضافہ کرنا انتہائی ناگزیر ہے، بلکہ یہ کام ایسا ہے جس پر علم سے زیادہ محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔

موجودہ دور میں اس کام سے غفلت کا نتیجہ ہے کہ ہمارے اعمال میں وہ جان اور روح نہیں رہی جو ہمیں حق شناسی کی راہ پر گامزن کر سکے اور شخصیت میں موجود ملکوتی جوہروں کو اجاگر کر سکے، بزرگوں کا اسی چیز کا سب سے زیادہ اہتمام ہوتا ہے اور مجاہدوں کا مقصود بھی یہی ہوتا ہے۔

یہاں ایک اہم نکتہ بیان کرنا ضروری ہے کہ فہم کی دو نوعیت ہوتی ہیں، ایک عقلی نوعیت کا فہم، دوسرا وجدانی نوعیت کا فہم (جسے ہم باطنی بصیرت کہتے ہیں)۔

عقلی فہم کے ساتھ اگر وجدانی فہم موجود نہ ہو تو فرد کے لئے تشکیک کی راہ سے بچنا دشوار ہوتا ہے اور نفس اور مادیت پسند حالات اسے زندگی کے کسی بھی موڑ پر سیکولرزم کی راہ پر لے جا سکتی ہیں، لیکن اگر عقلی فہم کی پشت پر وجدانی فہم یعنی باطنی بصیرت موجود ہوتی ہے تو فرد اتنا مستحکم ہو جاتا ہے کہ مادیت پرستی کی طوفانی لہریں بھی اسے متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔

یہ بہت اہم نکتہ ہے جس کی وجہ سے وجدانی فہم یعنی باطنی بصیرت کے حصول کا کام غیر معمولی اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے، اس سے عقلی فہم کی صلاحیت میں بھی کئی گنا زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے، موجودہ دور مادی افکار اور مادی نظریات کا دور ہے ان افکار سے جو مادہ پرست تہذیب وجود میں آئی ہے، لگ بھگ ہر فرد اس مادی تہذیب کے اثرات کی زد میں ہے، اس لئے ہمہ گیر مادی افکار اور مادی تہذیب کے اثرات سے بچاؤ کی صورت یہ ہے کہ وجدانی فہم یعنی باطنی بصیرت کے حصول کے لئے کاوشیں ہوں۔

اعتدال

امت مسلمہ کی خصوصیت

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ (سورۃ البقرہ: آیت ۱۴۳) اور (مسلمانو!) اسی طرح تو ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا ہے تا کہ تم دوسرے لوگوں پر گواہ بنو، اور رسول تم پر گواہ بنے۔

یہ سورۂ بقرہ کی آیت ہے جس میں اللہ رب العزت امت محمدیہ کے حوالے سے ایک خاص بات بیان فرماتے ہیں قرآن کریم کے مذکورہ مضمون کے سیاق وسباق میں امت مسلمہ کے حوالے سے جو باتیں ذکر ہوئی ہیں وہ یہ ہیں: ۱۔ امت کے افراد یعنی امت مسلمہ ۲۔ امت کا مرکز یعنی بیت اللہ ۳۔ امت کے نبی یعنی نبی کریم ﷺ۔ اس تحریر کا موضوع امتِ محمدیہ کے افراد سے متعلق ہے۔

امت مسلمہ کی خصوصیت

اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (سورۃ البقرۃ: آیت ۱۴۳)

"اور (مسلمانو!) اسی طرح تو ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا ہے۔"

اللہ رب العزت اس آیت کریمہ میں امت محمدیہ کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے ایک خاص اصطلاح ذکر فرماتے ہیں کہ ہم نے تمہیں "امتِ وسط" بنایا ہے۔ عربی میں "وسط" درمیانہ پن، اعتدال، میانہ روی اور بیچ کے راستے کو کہتے ہیں۔

اس کی مثال کچھ یوں ہے کہ جو چیز درمیان میں ہوتی ہے وہ زیادہ اچھی لگتی ہے اور زیادہ آویزاں ہوتی ہے اور اسی طرح کسی مجلس میں اسٹیج بنایا جاتا ہے تو بالکل بیچ میں بنایا جاتا ہے اور صدر مجلس کی کرسی بلکل اسٹیج کے بیچ میں لگائی جاتی ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اس مجلس میں سب سے معزز ہیں تو اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ تمہاری بھی خصوصیت ایسی ہی ہے کہ تم افراط و تفریط کا شکار نہیں ہو، نہ تم حد سے آگے بڑھنے والے ہو اور نہ حد سے گرنے والے ہو اس لیے کہ ہم نے تمہیں ایک معتدل اور درمیانی امت بنایا جو اعتدال پر اور انصاف پر قائم رہنے والی ہے تا کہ روز محشر تم لوگوں پر گواہ بن سکو اور حضور ﷺ تم پر گواہ بن سکیں۔

لہٰذا تمہاری سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تم امت معتدل اور امت وسط ہو اور درمیانے پن کے ساتھ رہنا جانتے ہو اور تمہیں اعتدال اور انصاف کرنا آتا ہے۔

روزِ محشر امت مسلمہ کی خصوصیت

رسول اللہ ﷺ کے دنیا میں آنے سے پہلے ماضی میں بہت سی امتیں رہی ہیں لیکن اللہ رب العزت نے کسی امت اور کسی قوم کو یہ اعزاز نہیں بخشا جو امت محمدیہ ﷺ کو بخشا ہے۔ اس بات کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ روزِ محشر تمام لوگ جمع ہوں گے تو کل ایک سو بیس صفیں قائم ہوں گی جن میں سے ۸۰ صفیں امت محمدیہ ﷺ کی ہوں گی اور بقیہ چالیس صفیں دیگر امتوں کی ہوں گی۔

پچھلی امتوں میں افراط و تفریط اور امت محمدیہ کی فضیلت

پچھلی جتنی امتیں گزری ہیں ان میں یہی خرابی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ بات کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرتے یا بہت ہی زیادہ معمولی بنا دیتے تو امت محمدیہ کی یہی خصوصیت بتائی کہ یہ باتوں کے اعتدال کو جانتی ہے اور دین و شریعت کے مزاج کو سمجھ کر اس پر عمل کرنا اس

امت کو آتا ہے اسی وجہ سے اس امت کو آخری اور سب سے زیادہ فضیلت والی امت قرار دیا جارہا ہے۔

فضیلت وانعام کا یہ سلسلہ اللہ رب العزت نے بنی اسرائیل کو بھی عطا فرمایا لیکن انہوں نے افراط و تفریط سے کام لیا اور بالآخر بہت سی آفات میں مبتلا ہو گئے یہاں تک کہ سیدنا عزیز علیہ السلام کو ابن اللہ قرار دے کر توحید تک کا انکار کر دیا اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نعوذ باللہ اللہ کا بیٹا مان لیا انتہا طرف یہ غلطی کر رہے ہیں کہ نبیوں کو خدا کا مقام دے رہے ہیں اور دوسری طرف معجزات کا انکار کر رہے ہیں گویا ان میں درمیانہ پن نہیں رہا کہ ایک طرف اتنا اونچا مقام دے رہے ہیں کہ بات کو آسمان تک پہنچاتے ہیں اور دوسری طرف نبی ان کے سامنے معجزات دکھاتے ہیں تو وہ انکار کر دیتے ہیں۔

یہی بات اگر صحابہ میں دیکھی جائے تو ان کا مزاج اعتدال سے بھرپور نظر آتا ہے کہ آپ ﷺ کے اشارے پر ہر صحابی اپنی جان و مال قربان کرنے کو تیار ہے لیکن کبھی یہ نہیں کہتا کہ میں رسول اللہ ﷺ کو نعوذ باللہ خدا کا درجہ دوں گا بلکہ کہتا یہی ہے کہ:

اشهد ان محمدا عبده ورسوله .

''میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔''

آپ ﷺ کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو اعتدال کی تربیت دینا

عن انس بن مالک رضی الله عنه يقول جاء ثلاثة رهط الى بيوت ازواج النبى صلى الله عليه وسلم يسالون عن عبادة النبى صلى الله عليه وسلم فلما اخبروا كانهم تقالوها فقالوا واين نحن من النبى صلى الله عليه وسلم قد غفر له ما تقدم من ذنبه وما تاخر قال احدهم اما انا فانى اصلى الليل ابدا وقال آخر انا اصوم الدهر ولا افطر وقال آخر انا اعتزل النساء فلا اتزوج ابدا فجاء رسول الله صلى الله عليه وسلم اليهم فقال:''انتم الذين قلتم كذا وكذا اما والله انى لاخشاكم لله واتقاكم له لكنى اصوم وافطر واصلى وارقد واتزوج النساء فمن رغب عن سنتى فليس منى''.

(مشکوٰۃ:۱۴۵)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، تین اشخاص نبی ﷺ کی عبادت کے متعلق پوچھنے کے لیے نبی ﷺ کی ازواج مطہرات کے پاس آئے۔ انہیں اس کے متعلق بتایا گیا، تو گویا انہوں نے اسے کم محسوس کیا، چنانچہ انہوں نے کہا ہماری نبی ﷺ سے کیا نسبت؟ اللہ نے تو ان کی اگلی پچھلی تمام خطائیں معاف فرما دی ہیں، ان میں سے ایک نے کہا: میں تو ہمیشہ ساری رات نماز پڑھوں گا۔ دوسرے نے کہا: میں دن کے وقت ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور افطار نہیں کروں گا اور تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے اجتناب کروں گا اور میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔ نبی ﷺ ان کے پاس آئے اور پوچھا: تم وہ لوگ ہو جنہوں نے اس طرح اس طرح کہا ہے، اللہ کی قسم! میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور تم سے زیادہ تقویٰ رکھتا ہوں، لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، رات کو نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں، پس جو شخص میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں۔''(مشکوٰۃ:۱۴۵)

بہت ہی خوب صورت اور تسلی بخش انداز میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کے توسط سے امت کو اعتدال کا پیغام دیا اور اپنی مثال دے کر بیان فرمایا تاکہ اس پر عمل کرنا، مشاہدہ کرنا، سیکھنا آسان ہو جائے اور ایک حتمی نکتہ یوں بیان فرمایا کہ یہی میرا طریقہ ہے یعنی شریعت ہے اور اسی معتدل انداز میں دنیا و آخرت کی کامیابی ہے باقی جو یہود و نصاریٰ کی طرح افراط و تفریط کا شکار ہو گا اس کا امت مسلمہ سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ اس امت کی پہچان ہی اعتدال ہے۔

شریعت کا منہج ومزاج

شریعت یہ نہیں بتائی کہ زندگی میں بیک وقت دین رہے گا یا دنیا رہے گی، یہ نہیں کہ اگر میں عبادت میں مگن رہا تو کسی سے تعلق نہیں رکھوں گا، نہ یہ کہ میں مکمل بازار سے چمٹ جاؤں یا پھر مسجد سے۔ بلکہ شریعت بتاتی ہے کہ تم نے دین دنیا کو ساتھ ساتھ لے کر چلنا ہے۔

تم نے تجارت بھی کرنی ہے اور عبادت کے فرائض بھی انجام دینے ہیں، تم نے اللہ کے حقوق بھی ادا کرنے ہیں اور اللہ کے بندوں کے حقوق بھی ادا کرنے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ تم اللہ کے حقوق ادا کرنے میں بندوں کے حقوق سے غافل ہو جاؤ اور نہ ایسا کہ بندوں کی خدمت میں ایسے لگے رہو کہ خدا کی بندگی ہی بھول جاؤ۔

البتہ شریعت فرق سمجھا دیتی ہے کہ تم مال کے لیے محنت ضرور کرو لیکن اسے اپنی ضرورت سمجھو اپنا مقصد مت سمجھو ورنہ تم "حب مال" کی بیماری کا شکار ہو جاؤ گے۔ اسی طرح دنیاداری کرو لیکن دنیا کے لیے اتنی ہی کوشش کرو جتنا تمہیں یہاں رہنا ہے اور آخرت کے لیے اتنی کوشش کرو جتنا تمہیں وہاں رہنا ہے اگر تم دنیا کی مختصر سی زندگی کے لیے آخرت والی محنت کرنا شروع کرو گے تو تم "حب دنیا" کی بیماری میں مبتلا ہو جاؤ گے جسے رسول اللہ ﷺ تمام خرابیوں کی جڑ والی بیماری قرار دیتے ہیں۔

عقائد میں اعتدال کی تعلیم

ایک مسلمان کچھ اہم باتوں پر ایمان لے آتا ہے لیکن اسے یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ عقائد میں تمام عقائد ایک برابر نہیں بلکہ ان میں ایک ترتیب قائم ہے مثلاً توحید کو عقائد میں سب سے پہلا درجہ حاصل ہی اور رسالت کو دوسرا۔ اب اگر کوئی عقیدہ رسالت پر اتنا زور دے کہ اسے توحید سے بھی زیادہ اہمیت کرے تو یہ اعتدال کی پٹڑی سے ہٹ جانے والی بات ہے۔

اسی طرح عقائد میں اعتدال نہ ہونے کی ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ عقیدہ توحید کو اس درجہ شدت سے بیان کیا جائے کہ امت کی ہر دوسرے فرد کو مشرک سمجھنے لگے۔ توحید پر ایمان لانے کا یہ مطلب ہرگز درست نہیں کہ اولیاء اللہ کی گستاخی کی جائے، ان کی کرامات کا انکار کیا جائے اور توحید کو سمجھانے کے بہانے اہل اللہ پر معاذ اللہ جملے کسے جائیں۔ یہ توحید کے بیان کرنے کا طریقہ ہے نہ ہی دعوتی حکمت عملی کے موافق ہے۔

بے شک توحید دین کا مرکزی ستون ہے اور شرک گناہ عظیم بلکہ ظلم عظیم ہے لیکن اس کی آڑ میں اسی توحید کے داعی صوفیاء اور اولیاء کی کردار کشی کرتے ہوئے سستے بازاری جملوں کا استعمال ان بزرگوں کے بالکل بھی شایان شان نہیں۔ یہ سب کے سب توحید کے حوالے سے اعتدال سے ہٹ جانے والے رویے ہیں۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام اور بزرگان دین کے ساتھ عقیدت و محبت کا تعلق پیدا ہو جانا ایک بہت بڑی نعمت ہے اور اس کے بغیر دین کے بہت سے پہلو ادھورے رہ جاتے ہیں لیکن اپنے سوا ہر ایک کو گستاخ قرار دینا اور محبت و عقیدت کو اپنا ٹھیکہ لینا غلط بات ہے۔ اسی طرح عقیدت کی آڑ میں اولیاء کو صحابہ سے بلند مرتبہ دینا یا انبیاء کو خدا کا مرتبہ دینا اور پھر عقیدت کی اوڑھنی اوڑھ کر شرک، بدعت کے دھندوں میں لگ جانا، اسلاف کے مدفن بیچ کھانا اور یہ سب عاشق رسول کا لیبل لگا کر کرنا جس پر اضافہ یہ کہ اس عقیدت کے سہارے خود کو توحید، نماز، روزہ اور حج جیسی عبادات سے بری سمجھنا یہ سوچ کر کہ یہی عقیدت میری نجات کے لے کافی ہے، یہ جہالت کی انتہا ہے جو کہ امت مسلمہ کی اعتدال والی خصوصیت کے یکسر خلاف ہے۔

اس میں اعتدال کا طریقہ یہ ہے کہ فرد توحید پر ایمان رکھے لیکن بزرگان دین کے مقام کو بھی سمجھے، رسالت پر ایمان رکھے لیکن عقیدت و محبت کا درست استعمال بھی سیکھے۔

تحریکات میں اعتدال کی ضرورت

اعتدال کا جنازہ نکالنے میں مختلف دینی تحریکات کے ناسمجھ کارکن بھی پیش پیش رہتے ہیں اور ہر ایک کی یہ سوچ ہوتی ہے کہ دین کا کام اسی طرز پر کرنے کی ضرورت ہے جس طرز پر ہماری تحریک کارفرما ہے حالانکہ یہ بات ہم بخوبی جانتے ہیں کہ دین کے مختلف شعبہ جات ہیں اور تمام شعبہ جات کو ایک ساتھ کرنے کی خصوصیت صرف رسول اللہ ﷺ کو حاصل

تھی جو تلاوت کتاب، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیہ نفس کی صورت میں قرآن آپ کے اوصاف و مناصب کے ضمن میں بیان کرتا ہے۔

باقی آپ کے دنیا سے جاتے ہی امت کے پہلے طبقے یعنی صحابہ کی جماعت میں ہی یہ سارے کام خوب صورت انداز میں تقسیم ہو چکے تھے۔ ٹھیک یہی ترتیب امت کے موجودہ طبقے میں پائی جاتی ہے جو کہ سیاست، تعلیم و تعلم، سلوک و تصوف، دعوت و تبلیغ، تحقیق و تصنیف و تالیف، جہاد واعلائے کلمۃ اللہ وغیرہ کی صورت میں امت کر رہی ہے ان میں سے کسی ایک کام کو ناگزیر سمجھنا اور باقی سب کو بے کار یا کم اہمیت کا حامل سمجھنا یا پھر ہر ایک سے اپنی تحریک کے نظم کا تقاضہ کرنا یہ سب کے سب بے اعتدالی کے رویے ہیں اور ان سب کو اعتدال پر لانے کی یہی ایک صورت ہے کہ امت کے کسی ایک شعبے پر لگ کر محنت کی جائے اور بقیہ شعبوں کو اپنا حریف اور مخالف سمجھنے کی بجائے ان کا رفیق بنا جائے۔ ضروری نہیں کہ رفیق بن کر اپنے آپ کو گھماتا پھرے کبھی کس کے ساتھ تو کبھی کس کے البتہ کسی ایک شعبے میں یکسوئی کے ساتھ جڑ جائے اور بقیہ شعبہ جات کی مخالفت نہ کرے۔ (جاری ہے)۔

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی

اسلامی نظام معیشت کی دو اخلاقی بنیادیں

عدل واحسان: اسلام کے معاشی نظام کے یہ دو زبردست ہتھیار ہیں۔ ان پر عمل درآمد کرنے سے دولت کو منصفانہ تقسیم کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے ایک تو یہ کہ لوگوں کو دوسروں پر بھلائی کرنے کی ترغیب آتی ہے اور اگر کوئی زیادتی کرے تو اسے انصاف کے ترازو میں تولا جائے:

"اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے، وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق سیکھو۔" (النحل: ۹۰)

اس مختصر سے فقرے میں تین ایسی باتوں کا حکم دیا گیا ہے، جن پر پورے انسانی معاشرے کی درستی کا انحصار ہے:

پہلی چیز "عدل" ہے جس کا تصور دو مستقل حقیقتوں سے مرکب ہے ایک یہ کہ لوگوں کے درمیان حقوق میں توازن اور تناسب قائم ہو۔ دوسرے یہ کہ ہر ایک کو اس کا حق بے لاگ طریقے سے دیا جائے۔ اُردو زبان میں اس مفہوم کو لفظ "انصاف" سے ادا کیا جاتا ہے، مگر یہ لفظ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اس سے خواہ مخواہ یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان حقوق کی تقسیم نصف نصف کی بنیاد پر ہو اور پھر اسی سے عدل کے معنی مساویانہ تقسیم حقوق کے سمجھ لیے گئے ہیں جو سراسر فطرت کے خلاف ہے۔ دراصل عدل جس چیز کا تقاضہ کرتا ہے، وہ توازن اور تناسب ہے، نہ کہ برابری۔ بعض حیثیتوں سے تو عدل بے شک افرادِ معاشرہ میں مساوات چاہتا ہے، مثلاً حقوقِ شہریت میں۔ مگر بعض دوسری حیثیتوں سے مساوات بالکل خلافِ عدل ہے، مثلاً: والدین اور اولاد کے درمیان معاشرتی اور

اخلاقی مساوات، یا اعلیٰ درجے کی خدمات انجام دینے والوں اور کمتر درجے کی خدمات ادا کرنے والوں کے درمیان معاوضوں میں مساوات۔ پس اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا حکم دیا ہے، وہ حقوق میں مساوات نہیں، بلکہ توازن و تناسب ہے اور اس حکم کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی، قانونی اور سیاسی و تمدنی حقوق پوری ایمان داری کے ساتھ ادا کیے جائیں۔

دوسری چیز ''احسان'' ہے جس سے مراد ہے: نیک برتاؤ، فیاضانہ معاملہ، ہمدردانہ رویہ، رواداری، خوش خلقی، باہمی مراعات، ایک دوسرے کا پاس ولحاظ، دوسرے کو اس کے حقوق سے کچھ زیادہ دینا اور خود اپنے حق سے کچھ کم پر راضی ہو جانا۔ یہ انصاف سے زائد ایک چیز ہے جس کی اہمیت اجتماعی زندگی میں ''عدل'' سے بھی زیادہ ہے۔ ''عدل'' اگر معاشرے کی اساس ہے تو ''احسان'' اس کا جمال اور کمال۔ ''عدل'' اگر معاشرے کو ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو ''احسان'' اس میں خوش گواریاں اور شیرینیاں پیدا کرتا ہے۔ کوئی معاشرہ صرف اس بنیاد پر کھڑا نہیں رہ سکتا کہ اس کا ہر فرد ہر وقت ناپ تول کر دیکھتا رہے کہ اس کا کیا حق ہے اور اسے وصول کر کے چھوڑے اور دوسرے کا کتنا حق ہے اور اسے بس اتنا ہی دے دے۔ ایسے ایک ٹھنڈے معاشرے میں کشمکش تو نہ ہو گی، مگر وہ محبت اور شکر گزاری اور عالی ظرفی اور ایثار اور اخلاص و خیر خواہی کی قدروں سے محروم رہے گا، جو دراصل زندگی میں لطف و حلاوت پیدا کرنے والی اور اجتماعی محاسن کو نشوونما دینے والی اقدار ہیں۔

تیسری چیز جس کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے، صلہ رحمی ہے جو رشتہ داروں کے معاملے میں ''احسان'' کی ایک خاص صورت متعین کرتی ہے۔ اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور خوشی و غمی میں ان کا شریک حال ہو اور جائز حدود کے اندر ان کا حامی و مددگار بنے۔ بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہر صاحب

استطاعت شخص اپنے مال پر صرف اپنی ذات اور اپنے بال بچوں ہی کے حقوق نہ سمجھے، بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق بھی تسلیم کرے۔

شریعتِ الٰہی ہر خاندان کے خوش حال افراد کو اس امر کا ذمہ دار قرار دیتی ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لوگوں کو بھوکا ننگا نہ چھوڑیں۔ اس کی نگاہ میں ایک معاشرے کی اس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہے کہ اس کے اندر ایک شخص عیش کر رہا ہو اور اسی کے خاندان میں اس کے اپنے بھائی بند روٹی کپڑے تک کو محتاج ہوں۔ وہ خاندان کو معاشرے کا ایک اہم عنصر ترکیبی قرار دیتی ہے اور یہ اصول پیش کرتی ہے کہ ہر خاندان کے غریب افراد کا پہلا حق اپنے خاندان کے خوش حال افراد پر ہے، پھر دوسرے پر ان کے حقوق عائد ہوتے ہیں۔ یہی بات ہے جس کو نبی ﷺ نے اپنے مختلف ارشادات میں وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، چنانچہ متعدد احادیث میں اس کی تصریح ہے کہ آدمی کے اولین حق دار اس کے والدین، اس کے بیوی بچے اور اس کے بھائی بہن ہیں، پھر وہ جو ان کے بعد قریب تر ہوں اور پھر وہ جو ان کے بعد قریب تر ہوں۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس معاشرے کا ہر واحدہ (Unit) اس طرح اپنے اپنے افراد کو سنبھال لے، اس میں معاشی حیثیت سے کتنی خوش حالی، معاشرتی حیثیت سے کتنی حلاوت اور اخلاقی حیثیت سے کتنی پاکیزگی و بلندی پیدا ہو جائے گی!

مندرجہ بالا تین بھلائیوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ تین برائیوں سے روکتا ہے جو انفرادی حیثیت سے افراد کو اور اجتماعی حیثیت سے پورے معاشرے کو خراب کرنے والی ہیں:

پہلی چیز ''فحشاء'' ہے جس کا اطلاق تمام بیہودہ اور شرمناک افعال پر ہوتا ہے۔ ہر وہ برائی جو اپنی ذات میں نہایت قبیح ہو، ''فحش'' ہے، مثلاً: بخل، زنا، برہنگی و عریانی، عمل قوم لوط، محرمات سے نکاح، چوری، شراب نوشی، بھیک مانگنا، گالیاں بکنا اور بدکلامی کرنا، وغیرہ۔ اس طرح علی الاعلان برے کام کرنا اور برائیوں کو پھیلانا بھی ''فحش'' ہے، مثلاً: جھوٹا پروپیگنڈا، تہمت تراشی، پوشیدہ جرائم کی تشہیر، بدکاریوں پر ابھارنے والے افسانے اور

ڈرامے اور فلمیں، عورتوں کا بن سنور کر منظر عام پر آنا، علانیہ طور پر مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط ہونا اور اسٹیج پر عورتوں کا ناچنا اور تھرکنا اور نازوادا کی فرمائش کرنا۔ وغیرہ

دوسری چیز "منکر" ہے جس سے مراد وہ بُرائی ہے جسے لوگ بالعموم بُرا جانتے ہیں، ہمیشہ سے بُرا کہتے رہے ہیں اور تمام شرائع الٰہیہ نے جس سے منع کیا ہے۔ تیسری "بغی" ہے جس کے معنی ہیں: اپنی حد سے تجاوز کرنا اور دوسرے کے حقوق پر دست درازی کرنا، خواہ وہ حقوق خالق کے ہوں یا مخلوق کے۔

اسلام کے نظام معیشت کے علاوہ کسی اور نظام میں یہ زبردست آلاتِ کار اور ترغیبات نہیں ملتیں۔ (اسلام اور جدید معاشی تصورات، ص: ۱۵۸۔۱۶۰)

حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری

مذہبی گروہ بندی سے بچاؤ کی ضرورت

الحمد اللہ وسلام علی عبادہ اصطفیٰ ۔ اما بعد
قال النبی ﷺ المسلم اخو المسلم لا یظلمہ ولا یسلمہ ۔

ارشاد رسول ﷺ ہے کہ مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اُسے بے مدد چھوڑتا ہے۔ امت مسلمہ کے اتحاد واتفاق کی اہمیت وضرورت ہر دور میں رہی ہے، مگر عصر حاضر کے معروضی حالات میں اس کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔ آج پورے عالم میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور کمزور سیاسی پوزیشن کی ایک اہم وجہ ان کا باہمی اختلاف بھی ہے۔ اگر اختلاف کی یہ خلیج طے ہو جائے تو مختلف رنگوں، خطوں، قبیلوں اور گروہوں میں بٹی ہوئی یہ قوم پھر سے امتِ واحدہ بن سکتی ہے۔

اسلامی تعلیمات سے واجبی سی واقفیت رکھنے والا مسلمان بھی یہ حقیقت سمجھتا ہے کہ اسلام چند رسوم عبادات پر مشتمل محض ایک مذہب نہیں، بلکہ فرد ومعاشرہ کی انفرادی واجتماعی حیات کی تمام تفاصیل جزئیات پر مشتمل ایک جامع دین اور ضابطۂ حیات ہے۔ اسلام کی عظیم الشان عمارت جس بنیاد پر قائم ہوئی، وہ باہمی اتحاد واتفاق تھا، ارشاد باری: وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۔(آل عمران: ۱۰۳) اور اللہ جل شانہ کے اس عظیم انعام کو یاد رکھو کہ تم آپس میں دشمن تھے پس اللہ ہی نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے۔

قرآن کریم امت مسلمہ کی قوت وشوکت کا راز ان کے باہمی اتفاق میں مضمر بتلاتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں جہاں کہیں مسلمانوں کو ہزیمت ہوئی، اس کا سبب باہمی اختلاف ونزاع ہوا، قرآن کریم کے یہ الفاظ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں: وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ

رِیْحُکُمْ(الانفال:۴۶) کہ آپس میں اختلاف نہ کرنا ورنہ کمزور پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا کھڑ جائے گی۔

اگر دو مسلمانوں یا دو جماعتوں میں تقاضائے بشریت کبھی اختلاف و نزاع کی نوبت آجائے تو قرآن کریم نے پوری اسلامی برادری کو حکم دیا ہے کہ وہ ایمان کے رشتۂ اخوت کو ٹوٹنے نہ دیں اور اُن کے درمیان پیدا ہونے والے فاصلوں کو ختم کریں، اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ(الحجرات:۱۰) بے شک تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں پس اپنے بھائیوں کے درمیان (نزاع کی صورت میں) صلح کروادیا کرو۔

رسول اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو ایک مضبوط دیوار سے تشبیہ دی ہے، جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ کے لیے استحکام و ثبات اور مضبوطی کا باعث بنتی ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے امت مسلمہ کے اتحاد کو ذہن نشین فرمانے کے لیے اپنے مبارک ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم پیوست فرمایا، تاکہ امت مسلمہ کا ہر فرد اتحاد کے مفہوم سے آشنا ہو جائے۔ مدینہ منورہ میں پہلی اسلامی ریاست کی بنیاد اسی رشتۂ اخوتِ اسلامی پر استوار کی گئی تھی۔

دورِ حاضر فتنہ و فساد کا دور ہے۔ مختلف قومیں اور حکومتیں اپنے مخصوص مفادات کے لیے دوسروں سے برسرپیکار ہیں۔ ہوا و ہوس کی اس جنگ اور استعمار کی اس لڑائی میں روس و امریکہ کی آویزش قابل فہم ہے کیتھولک اور پروٹسٹوں کی باہمی منافرت سمجھ میں آتی ہے۔ سرمایہ داروں اور کمیونسٹوں کی باہمی دشمنی باعث حیرت نہیں کہ ان تمام نظریات کی بنیاد کسی غرض صحیح پر نہیں، بلکہ محض مفادات پر ہے اور جہاں کسی فریق کے مفادات پر ضرب پڑے گی وہ دوسرے کو اپنا دشمن سمجھے گا، مگر اسلام ذاتی، جماعتی، گروہی، علاقائی اور لسانی وحدتوں اور ان کے مفادات سے بہت بلند ہے۔ اسلام کے علمبردار کسی حد، کسی رسول، کسی کتاب، کسی قبلہ اور کسی ہی نظریہ کے ماننے والے ہیں، یہی رشتہ ان کے درمیان محبت و اخوت اور الفت و برادری کے پاکیزہ جذبات پیدا کرتا ہے۔

اسلام میں فرد کا وجود ملت سے مربوط ہے۔ تنہا اس کی کوئی حیثیت نہیں، ملت کا نفع و نقصان امت مسلمہ کے ہر فرد کا نفع و نقصان ہے۔ ملت سے کٹ کر اگر کوئی فرد بڑے سے بڑے نفع کو بھی حاصل کرلے تو اسلام کے اجتماعی نقطۂ نظر سے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

اسلام جس طرح امت مسلمہ کو علاقے، زبان اور رنگ کی بنیاد پر علیحدہ تشخص قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتا، اسی طرح نسب کی بنیاد پر مختلف فرقوں اور جماعتوں کو بھی برداشت نہیں کرتا۔

قرآن کریم کے یہ الفاظ اس مسئلہ میں بالکل واضح ہیں۔ وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْبَیِّنٰتُ ۔ (آل عمران:۱۰۵) یعنی اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کی طرح باہم متفرق نہ ہو جانا اور واضح احکام آنے کے بعد آپس میں اختلافات نہ کرنا۔

یہ درست ہے کہ فروعی احکام میں اختلاف رائے ایک فطری امر ہے اور اسلام نے فطرت کے اس تقاضے پر کوئی پابندی بھی عائد نہیں کی، لیکن یہی اختلافات اگر بڑھ کر فتنہ و فساد اور جنگ و جدال کا باعث بن جائے تو یہ اختلاف اسی افتراق ممنوع میں داخل ہو جائے گا، جسے قرآن کریم نے یہود و نصاریٰ کا وطیرہ قرار دیا ہے۔

اپنے مسلک سے محبت و عقیدت ہر مسلمان کا حق ہے، لیکن اس محبت و عقیدت میں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ہمارا اصل دشمن کون ہے؟ پورا عالم کفر مسلمانوں کا مشترکہ دشمن ہے اور دشمن کے پاس سب سے مہلک و خطرناک ہتھیار یہ ہے کہ مسلمانوں کو جماعتوں، فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کر کے ان کی جمعیت کو منتشر کردے۔ دشمن کی اس سازش سے باخبر ہونے کے بعد اگر ہم بلاامتیاز مسلک خود کو ایک متحد قوم کی حیثیت دے لیں تو ہمیں نہ کسی ایٹم بم کا خوف ہے، نہ پرتھوی میزائل کا، نہ ہائیڈروجن بم کا اندیشہ ہے اور نہ دشمن کے لڑاکا طیاروں کا۔ ان شاء اللہ العزیز ہماری متحدہ قوت ہی دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی ہوگی۔

مولانا محمد زبیر فضل

انتخاب: مولانا عبدالستار

مولانا جلال الدین رومی رحمہ اللہ علیہ

ساتویں صدی میں سارا عالم اسلام علم کلام کے مسائل و مباحث سے گونج رہا تھا، جو شخص علم کلامی کی اصطلاحات کو نہیں سمجھتا تھا، وہ پڑھا لکھا نہیں سمجھا جاتا تھا، فلسفیانہ مباحث اور علم کلام کی معرکہ آرائیوں نے عالم اسلام کو بحران میں مبتلا کر دیا تھا، ایسی حالت میں عالم اسلام کو ایسی بلند اور طاقتور شخصیت کی ضرورت تھی، جو ایسے علم کلام کی بنیاد رکھے جو دماغوں سے زور آزمائی اور مخالفین کی زبان بندی کے بجائے دماغ کی شکن کو دور کرے، دل کی گرہ کھولے اور دل کو ایمان اور یقین واطمینان سے بھر دے۔ یہ شخصیت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کی تھی، آپ کی مثنوی علم کلام کی بے اعتدالیوں کے خلاف اعلان جنگ ہے اور آپ نے مثنوی کے ذریعے ایسے علم کلام کی بنیاد رکھی، جس کی عالم اسلام کو سخت ضرورت تھی۔

آپ کا نام محمد، لقب جلال الدین ہے آپ کا نسب باپ کی طرف سے نو واسطوں سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مل جاتا ہے اور ماں کی جانب سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے، آپ کو رومی کے لقب شہرت ملی۔ مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کے آباء علاقہ بلخ خراسان کے رہنے والے تھے، وہیں آپ کی پیدائش ہوئی، آپ ۶ ربیع الاول ۶۰۴ھ کو پیدا ہوئے، آپ کے والد کا نام محمد اور لقب بہاء الدین تھا۔ حضرت بہاء الدین رحمۃ اللہ علیہ نو عمری میں ہی تمام علوم میں کامل ماہر ہو گئے، آپ کے مریدوں کی تعداد بے شمار تھی، خوارزم شاہ آپ کا معتقد تھا، روز سلطان آپ کی زیارت کے لیے آیا اور کثیر مجمع دیکھا تو عالم سے کہا جو رکاب شاہی میں تھے مخاطب ہو کر کہا کہ کتنا کثیر مجمع ہے فاضل

مذکور کو موقع ملا، اور کہا کہ اگر اس کی تدبیر نہیں کی گئی تو آپ کی سلطنت میں خلل واقع ہو سکتا ہے اور یہ مشورہ دیا کہ خزانہ اور قلعوں کی چابیاں مولانا بہاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھیج کر یہ کہلانا چاہیے کہ سب عوام تو آپ کے ساتھ ہے، میرے پاس اُمور سلطنت کی صرف چابیاں ہیں وہ بھی حاضر ہیں۔

آپ نے اس پیغام کو سن کر بلخ سے ہجرت کا ارادہ فرمایا اور ارشاد فرمایا: سلطان اسلام سے میرا سلام کہنا، یہ خزانہ، ملک، لشکر بادشاہوں کے لائق ہیں، ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہے، میں جمعہ کو وعظ کہہ کر چلا جاؤں گا، آپ کے اس اعلان سے کہ تہلکہ عظیم برپا ہو گیا، جس سے خود خوارزم شاہ پریشان ہو گیا اور خود حاضر ہوا اور آپ کو سفر سے روکا، مگر آپ نے سفر کے بارے میں تہیہ کیا ہوا تھا، خوارزم نے یہ گزارش کی آپ اس طرح سے روانہ ہوں کہ لوگوں کو خبر نہ ہو، ورنہ سخت فتنہ برپا ہو جائے گا۔ مولانا نے اس کو منظور فرمایا، آپ نے جمعہ کو وعظ کیا، دوشنبہ کو بلخ سے بغداد کی طرف روانہ ہوئے، اور ۶۲۶ھ میں سلطان روم کی خواہش پر قونیہ تشریف لے گئے، سلطان علاؤ الدین کیقباد نے خود استقبال کیا اور آپ نے مدرسہ قونیہ میں قیام فرمایا، دو برس قیام کے بعد ۶۲۸ھ میں آپ کا انتقال ہو گیا، اس مدت میں مولانا جلال الدین رومی اپنے والد کے ہمراہ رہے اور علوم ظاہری و باطنی آپ سے حاصل کرتے رہے اور اپنے والد کے انتقال کے بعد سلطان وقت اور علماء واکابر کے اتفاق رائے سے آپ اپنے والد کے جانشین ہوئے۔

آپ نے سلسلہ درس وتدریس اور وعظ ونصیحت کو جاری رکھا اور جدید علوم حاصل کرنے کے لیے شام کا رخ کیا اور حلب میں مدرسہ حلاویہ میں قیام پذیر ہوئے اور کمال الدین ابن العدیم سے استفادہ کیا، حلب سے آپ دمشق چلے گئے اور مدرسہ مقدسیہ میں قیام فرمایا، دمشق اس وقت مجمع علماء تھا اور ۶۳۴ھ یا ۶۳۵ھ میں دوبارہ قونیہ آ گئے اور مستقل قیام فرمایا اور قونیہ شہر اس زمانے میں مدینۃ العلماء بن گیا تھا اور ان علماء میں مولانا جلال الدین کو فوقیت

تھی، درس وتدریس کے علاوہ آپ کا دوسرا شغل فتوی نویسی اور وعظ کرنا تھا۔

۶۴۲ھ میں مولانا کی زندگی میں وہ واقعہ پیش آیا، جس نے زندگی میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ آپ کی ملاقات شمس تبریز رحمتہ اللہ علیہ سے ہوئی، ان ہی کی وجہ سے آپ مولانا رومی کے نام سے مشہور ہوئے۔

حضرت شمس تبریز رحمتہ اللہ علیہ کے استاد مرشد شیخ نے ان سے کہا محمد تم قونیہ جا رہے ہو، وہاں ایک نوجوان ہے اس کے دل میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت اور تڑپ ہے، وہ ایک دل سوختہ ہے اسے روشن کرو۔ شمس تبریز ۲۶ جمادی الآخر ۶۴۲ کو قونیہ پہنچے۔

شمس تبریز رحمتہ اللہ علیہ کا نام محمد بن علی تھا، وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت میں سب کچھ بھول گئے تھے، اپنے آپ میں گم رہتے۔ شمس تبریز رحمتہ اللہ علیہ کو آنحضرت ﷺ کے عشق میں کئی کئی روز تک غذا کی خواہش نہیں ہوتی تھی۔ ازار بند بنا کر فروخت کرتے اور گزر بسر کرتے۔ آپ اطراف عالم میں مرد الٰہی کی تلاش میں پھرنے لگے، کثرت اسفار کی وجہ سے لوگ آپ کو شمس پرندہ کہنے لگے تھے اور قونیہ میں حضرت جلال الدین رومی رحمتہ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی۔

مولانا رومی رحمتہ اللہ علیہ کے ظاہری علوم نے اس آگ کو دبا رکھا، جو مولانا کے باطن میں فروزاں تھی، لیکن شمس تبریز رحمتہ اللہ علیہ سے ملاقات کے بعد شمس تبریز رحمتہ اللہ علیہ نے اس آتش کو دوچند کر دیا اور وہ سراپا سوز و ساز بن گئے۔ شمس تبریز رحمتہ اللہ علیہ کی ملاقات نے مولانا کو نئی روح اور حقائق اور ذوق کی نئی دنیا عطا کی آپ فرماتے ہیں کہ:

شمس تبریزی بما راہ حقیقت بنمود
ماز فیض قدم اوست کہ ایماں داریم

مولانا رومی، شمس تبریز رحمتہ اللہ علیہ کے ایسے معتقد ہوئے کہ ان سے ملاقات کے بعد مولانا رومی نے درس تدریس وعظ وغیرہ سب ترک کر دیا، خود آپ فرماتے ہیں:

عطار دوار دفتر پارہ بودم
زدست او زمانے می نشستم
چو دیدم نوح پیشانی ساقی
شدم مست و قلمہا را شکستم

یہ بات مولانا کے شاگردوں اور مریدوں پر بہت شاق گزری، شمس کے حالات سے لوگ واقف نہیں تھے، سب بہت پریشان تھے کہ یہ کون آدمی ہے کہ علم کے پہاڑ کو تنکے کی طرح بہالے جائے۔ لوگوں نے حضرت شمس تبریز رحمتہ اللہ علیہ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا، وہ ان کو ساحر سمجھنے لگے کہ ان کی وجہ سے حضرت ہم سے دور ہو گئے ہیں، حضرت شمس تبریز رحمتہ اللہ علیہ ان لوگوں کی گستاخیوں پر تحمل کرتے رہے، لیکن جب معاملہ بگڑتا چلا گیا تو وہ ایک دن خاموشی سے قونیہ سے نکل گئے۔

حضرت شمس تبریز رحمتہ اللہ علیہ کی جدائی مولانا رومی رحمتہ اللہ علیہ پر سخت شاق گزری، مریدوں نے سوچا کہ حضرت شمس رحمتہ اللہ علیہ چلے گئے ہیں، اب مولانا ہماری طرف متوجہ ہوں گے، لیکن حضرت کی توجہ جو پہلے تھی وہ بھی جاتی رہی۔ ان کی اس حرکت کی وجہ سے اصحاب صدق ووفا بھی مولانا کی صحبت سے محروم ہو گئے۔

مولانا رومی رحمتہ اللہ علیہ بہت پریشان تھے اور بے قرار رہتے تھے کہ حضرت شمس رحمتہ اللہ علیہ کا خط دمشق سے ملا، اس خط کو پا کر حضرت کی طبیعت کچھ سنبھلی۔ مولانا نے حضرت شمس کو دوبارہ بلانے کی تدبیر کی اور اپنے صاحبزادہ سلطان کو ان کے پاس بھیجا، حضرت شمس دوبارہ قونیہ تشریف لائے تو مولانا کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں تھی، جن لوگوں نے حضرت شمس کے بارے میں گستاخیاں کی تھیں، انہوں نے آکر معافی مانگی، لیکن کچھ عرصے کے بعد دوبارہ چلے گئے تو مولانا رومی کی حالت متغیر ہونا شروع ہو گئی، اسی زمانے میں آپ نے

حضرت شمس رحمۃ اللہ علیہ کے فراق میں غزلیں کہیں، آپ کی یہ درد انگیز غزلیں زیادہ تر اسی زمانے کی ہیں، اسی جوش و خروش کے عالم میں آپ شام کی طرف روانہ ہوئے۔ دمشق میں حضرت شمس کا پتہ نہیں چلا تو نہیں چلا تو پھر قونیہ تشریف لے آئے، پھر دوبارہ جوش میں آکر دمشق کی طرف روانہ ہوئے اور مولانا روم حضرت شمس کے ملنے سے بالکل مایوس ہو گئے اور دوبارہ قونیہ تشریف لے آئے، اس کے بعد آپ نے شیخ صلاح الدین کو اپنا خلیفہ بنایا اور اپنا جلیس خاص بنایا۔

شہ صلاح الدین ز بعد شمس دین
گشت او اندریں درزش معین
حال و قالش از وجودش می فزود
سر ہائے نادر از وے می شنود

شیخ صلاح الدین قونیہ کے قریب ایک گاؤں کے تھے، غریب والدین کی اولاد تھے جو ماہی گیری کیا کرتے تھے، ابتدائے حال سے [illegible] و [illegible] میں مشہور تھے، سید برہان الدین [illegible] قونیہ آئے تو آپ ان کے مرید ہو گئے اور ان کی نظروں میں اختصاص خاص پیدا کیا، سید برہان الدین کے انتقال کے بعد مولانا رومی سے تجدید بیعت کی اور دس سالہ مدت میں آپ حضرت رومی کے خلیفہ خاص رہے اور یکم محرم ۶۵۷ھ کو آپ کا انتقال ہوا۔

شیخ صلاح الدین کے انتقال کے بعد مولانا رومی نے چلپی حسام الدین ابن اخی ترک کو اپنا جانشین بنایا اور مثنوی شریف کی تصنیف اسی دور کا کارنامہ ہے۔ مولانا رومی برجستہ اشعار زبان مبارک سے ادا کرتے جاتے اور مولانا حسام الدین لکھتے جاتے، لکھنے کے بعد حسام الدین اس کو بلند آواز سے خوش آوازی کے ساتھ پڑھتے اور بعض مرتبہ پوری رات گذر جاتی۔ مثنوی کی جلد اول مکمل ہوئی تھی کہ حسام الدین کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا، شیخ حسام الدین رحمۃ اللہ علیہ کی

طبیعت پر سخت اثر پڑا، دو سال تک یہ سلسلہ رکا رہا، پھر شیخ حسام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے تقاضے پر شروع ہوا اور مولانا جلال الدین رومی کی وفات تک جاری رہا۔

مثنوی مولانا روم دو حصوں پر مشتمل ہے اس میں ہزاروں شعر ہیں۔ ان اشعار میں مولانا نے اسلام کی تعلیمات کو بالکل صحیح انداز میں پیش کیا ہے، اسلامی ادب میں ایسی کتابیں شاذ ملیں گی جنہوں نے عالم اسلام کے اتنے وسیع حلقے کو اتنی طویل مدت تک متاثر رکھا، دماغ اور دلوں کو نئی حرارت بخشی، مولانا ایک نئے علم کلام کے بانی ہیں اور اس کے ذریعے وہ مخاطب کو لاجواب کرنے کی کوشش کرتے ہیں، گویا کہ وہ بات پہلے سے اس کے دل میں ہے، مخاطب کو شرح صدر اور اطمینان قلب پیدا ہوتا، جو علم کلام کے پورے کتب خانہ سے حاصل نہیں ہوتا تھا، لیکن بہت سے فاسد العقیدہ صوفیوں اور اہل ہویٰ نے اس سے غلط فائدہ بھی اُٹھایا، اس لیے مولانا روم کی مثنوی کے مضامین یکسر تنقید سے خالی نہیں اور خطا سے مبرا نہیں، مولانا ایک [illegible] تک تصوف کے دائرہ کار میں نہیں آئے، آپ کی زندگی عالمانہ جاہ و جلال کی ایک شان رکھتی تھی، لیکن سلوک میں داخل ہونے کے بعد یہ حالت بدل گئی، درس و تدریس و افتاء کا سلسلہ تو بعد میں بھی جاری رہا، لیکن سلوک کے بعد زیادہ تر معرفت و محبت کے نشے میں سرشار رہے۔

آپ کے مزاج میں انتہائی درجے کا زہد اور قناعت تھا، آپ کے پاس ہر قسم کے تحفے و ہدایا آتے، لیکن آپ اپنے پاس کچھ بھی نہ رکھتے، گھر میں تنگی بھی ہو جاتی تھی اور جس دن گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہوتا تو بہت خوش ہوتے کہ آج ہمارے گھر سے درویشی کی بو آ رہی ہے۔ سائل کے سوال کرنے پر اس کو عطا کرتے حتیٰ کہ جسم پر جو کچھ کرتا یا عبا ہوتا وہ بھی اتار کر دے دیتے۔ حضرت مولانا جلال الدین رومی کا انتقال ۵ جمادی الآخریٰ ۶۷۳ھ کو [illegible] غروب

آفتاب کو ہوا، آپ کی عمر انتقال کے وقت ۶۸ سال تین ماہ کی تھی مؤرخوں نے لکھا ہے کہ آپ کی وفات سے پہلے چالیس روز تک زلزلہ کے جھٹکے آتے رہے اور بعض کے نزدیک مسلسل چار دن تک زلزلہ آتا رہا، قونیہ کے لوگوں نے حضرت جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ سے دعا کی درخواست کی بعض نے یہ بھی پوچھا کہ یہ زلزلے کیوں آرہے ہیں؟ مولانا اس زمانے میں بیمار تھے آپ نے فرمایا کہ زمین بھوکی ہے وہ اپنا حق مانگ رہی ہے۔ آپ نے وفات سے پہلے یہ شعر پڑھا:

گر مومنی وشیریں ہم مومنست مرگت
در کافری و تلخی ہم کافرست مردن

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم مومن اور میٹھے یعنی اچھے آدمی ہو تو تمہاری موت بھی میٹھی اور مومنوں کی طرح ہوگی اور اگر تم کافر اور کڑوے آدمی ہو تو تمہاری موت بھی کڑوی اور کافرانہ ہوگی۔ آپ کے جنازے کو باہر لائے تو قیامت کا ازدحام برپا ہوا ہر قوم وملت کے لوگ ساتھ تھے، اور سب روتے جاتے تھے، یہودی اور عیسائی توریت وانجیل پڑھتے جاتے تھے، مسلمان ان کو ہٹاتے مگر وہ باز نہیں آتے، فساد کا اندیشہ ہوا۔ یہ خبر معین الدین پروانہ حاکم قونیہ کو پہنچی تو اس نے راہبوں اور قسیسوں سے پوچھا کہ تمہیں اس امر سے کیا تعلق ہے، انہوں نے کہا کہ ہم نے انبیاء سابقین کی حقیقت کو انہی کے بیان سے سمجھا اور اولیائے اکمل کی روش کو انہی کی روش سے جانا، وہ لوگ اسی طرح تابوت کے ساتھ رہے، ہجوم کی حالت یہ رہی کہ تابوت صبح سویرے مدرسہ سے روانہ ہوا تھا، اور شام کے قریب قبرستان پہنچا، بالآخر [illegible]۔ یہ آفتاب فقر وتصوف ہمیشہ کے لئے نظروں سے نہاں ہوگیا۔ مولانا شبلی مرحوم سوانح مولانا روم میں لکھتے ہیں:

"مولانا ایک مدت تک تصوف کے دائرے میں نہیں آئے، آپ کی زندگی عالمانہ جاہ وجلال کی ایک شان رکھتی تھی، ان کی سواری جب نکلتی تھی تو علماء وطلبہ بلکہ امراء کا ایک بڑا گروہ رکاب میں ہوتا تھا، سلاطین وامراء کے دربار سے بھی ان کو تعلق تھا، لیکن سلوک میں داخل ہونے کے ساتھ یہ حالت بدل گئی، درس تدریس، افتاء وافادہ کا سلسلہ اب بھی جاری تھا لیکن وہ پچھلی زندگی کی محض ایک یادگار تھی ورنہ زیادہ تر محبت ومعرفت کے نشے میں سرشار رہتے۔" (تلخیص تاریخ دعوت وعزیمت)

مولانا محمد یوسف
ترتیب و تشریح محمد موسیٰ بھٹو

بندہ مؤمن کی طرز زندگی

اور اس کے اصول و آداب

اعتراض سے ضد کی نفسیات کا جاگ جانا

•اعتراض سے محرومی ہوتی ہے، حق بات کو قبول کرنے کی استعداد کمزور ہوتی ہے۔

(اعتراض سے ضد کی نفسیات جاگ جاتی ہے جو صحیح بات کو قبول کرنے کی راہ میں رکاوٹ ہوتی ہے، اعتراض سے دوسروں کو نیچے کرنا اور اپنی بات اور اپنی شخصیت کو اوپر کرنا مقصود ہوتا ہے، ایک ہے اعتراض کرنا، دوسرا ہے سمجھنے کی غرض سے سوال کرنا یا مسئلہ کی نوعیت کا فہم حاصل کرنا، اس میں ضد کا پہلو شامل نہیں ہوتا، بات کو سمجھنے کی غرض سے سوال کرنا یا پوچھنا، اس سے صحیح بات کو سمجھنے کا راستہ کھلتا ہے، اعتراض کا جواب دینے سے بحث مباحثہ بلکہ کج بحثی کا راستہ کھلتا ہے، اور گرما گرمی کا ماحول پیدا ہوتا ہے نیز ایک دوسرے سے دوری پیدا ہوتی ہے۔

اس لئے بزرگوں کے ہاں اعتراض کا جواب خاموشی کی صورت میں ملتا ہے، چونکہ اعتراض کا جواب دینے سے وقت کا ضیاع بھی ہوتا ہے، اس لئے خاموشی بہتر ہے۔

اعتراض کا نقصان دہ پہلو یہ ہے کہ اس سے فرد کی انا جاگ جاتی ہے، بالخصوص صلحائے امت پر اعتراض تو سب سے زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے، اس سے فرد زندگی بھر سنبھلنے نہیں پاتا اور انعام یافتہ لوگوں کی راہ پر گامزن ہونے میں ناکام ہوتا ہے، اعتراض بظاہر معمولی چیز نظر آتا ہے، لیکن اس کی وجہ سے جو نقصان ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ حقیقی دینداری سے محرومی ہوتی ہے، اگرچہ ظاہری دینداری کی طلب پیدا ہو جائے، لیکن باطنی بیماریوں سے بچاؤ کی صورت پیدا نہیں ہوئی، بالخصوص اعتراض ذہن اور مزاج کا حصہ بن جائے اور صلحائے امت پر اعتراض کی وجہ سے ان پر عدم اعتماد پیدا ہو جائے تو اس طرح کے اعتراض کی نفسیات سے دل میں حجابات پیدا ہونے لگتے ہیں، اور فرد زندگی بھر باطنی بیماریوں سے چھٹکارے کی راہ پر آنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

یہاں یہ نکتہ بیان کرنا شاید غیر ضروری نہ ہو کہ بزرگوں کے ہاں جو علم سکھائے جاتے ہیں اور ان کی تربیت سے جو چیزیں حاصل ہوتی ہیں، وہ یہی ہیں کہ اعتراض اور ضد کی نفسیات پر کنٹرول کیا جائے، غصہ اور اشتعال کے شیطان سے بچا جائے، دوسروں کے اکرام کے ذریعہ اپنے اندر عاجزی پیدا کی جائے، وغیرہ وغیرہ، یہ علوم ایسے ہیں جو باطن کی گہرائیوں سے تعلق رکھتے ہیں، یہ علوم کتابوں سے حاصل نہیں ہوتے، یعنی عملی زندگی کا حصہ نہیں بنتے، بلکہ یہ علوم صحبت اہل اللہ سے حاصل اور منتقل ہوتے ہیں۔

کتنا بڑا نقصان ہے، جو اعتراض کی نفسیات پیدا ہونے سے ہوتا ہے، سنبھلنے اور محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ جو نقصانات بیان کئے گئے وہ اعتراض پر مبنی تنقید کے نقصانات ہیں، لیکن جس تنقید میں افہام و تفہیم اور سمجھنے سمجھانے کا پہلو غالب ہو، وہ اعتراض کے ضمن میں شامل نہیں ہے، اس تنقید سے فکر و عمل کی اصلاح ہوتی ہے اور معاملے کے بہت سارے ایسے پہلو سامنے آتے ہیں، جو نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں، نیز اس سے نئی معلومات بھی حاصل ہوتی ہے، اس طرح کی تنقید کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے، بلکہ اس سے آگے بڑھکر یہ

بھی کہوں گا کہ جدید لوگوں کی ذہن کی تشکیل کچھ اس طرح ہوئی ہے کہ اعتراض اس کے مزاج کا حصہ بن گیا ہے، بالخصوص ذہین افراد کے مزاج کا تعلیمی اداروں سے سوشل میڈیا تک، یہ سب شکوک وشبہات اور اعتراض کی نفسیات پیدا کرتے ہیں، اس لئے جدید لوگوں اگر اعتراض کے ذہنیت سے بات پوچھنا چاہتا ہے تو اس کی ذہنی سطح کے مطابق حکمت، محبت اور نرمی سے اسے جواب دینے اور ممکن حد تک مطمئن کرنے کی کوشش کرنا، وقت کی اہم ضرورت ہے جدید افراد کی اعتراض کی ذہنیت قابل رحم بات ہے، یہ مجبوری کی طلب ہے، یہاں خاموشی مناسب نہ ہوگی، اعتراضات کے نقصانات کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کو حکمت اور نرمی سے سمجھانا چاہئے۔

نیک لوگوں کو حاصل سعادت

•نیک لوگوں کی نماز جنازہ پڑھنے کے لئے شہیدوں کی روحیں اور فرشتے آسمان سے اترتے ہیں۔ (یہ کتنی بڑی سعادت ہے جو نیک لوگوں کو حاصل ہوتی ہے، اس لئے اپنی دینی زندگی کو جتنا زیادہ بہتر بنایا جا سکتا ہے بنایا جائے قرآن میں ایک آیت کا ترجمہ ہے، بے شک وہ لوگ جنہوں نے اللہ کو اپنا رب کہا پھر اس پر جم گئے تو ان پر فرشتے اترتے ہیں)۔

اللہ سے توجہ ہٹنے کے نقصانات

•آج جس قدر ہماری (توجہ) نظر اللہ کی ذات سے ہٹی ہوئی ہے، اسی قدر ہماری دینداری میں کمزوری ہے۔ (اللہ سے توجہ ہٹنے سے نفس اور شیطان حملہ آور ہوتے ہیں اور دینداری میں خلل پیدا ہونے لگتا ہے، اس لئے توجہ الی اللہ کے ملکہ کو مستحکم کرنا ضروری ہے، دینداری کی طلب کے خستہ ہونے کا بنیادی سبب ہی یہی ہے کہ دل اور ذہن پر اللہ کا نقش غالب نہیں ہے۔ یہ نقش غالب ہوتا ہے تو سارے اعمال آسان ہونے لگتے ہیں اور حقیقی دینداری کی استعداد پیدا ہونے لگتی ہے۔ اللہ سے نیک توجہ مبذول کرنے کی راہ میں حائل

رکاوٹیں دور نہ ہوں گی تب تک ہمارے سارے کام بگڑتے رہیں گے اور حقیقی دینداری پیدا نہ ہو سکے گی۔)

صبح اور عصر کے بعد کے وقت کا
نورانیت کا حامل ہونا

•صبح کی نماز کے بعد طلوع شمس تک کا وقت اللہ کے ذکر کے لئے اپنے اندر بڑی نورانیت رکھتا ہے، اس کو بے قدر ضایع کرے گا۔ (صبح اور شام کے اوقات جن کا یہاں ذکر کیا گیا، ان اوقات میں نورانیت زیادہ ہوتی ہے، ان اوقات میں دل، ذکر سے زیادہ بہتر طور پر فیضیاب ہوتا ہے اور ذکر کے اثرات زیادہ قبول کرتا ہے۔

اہل اللہ کے ہاں ان دونوں اوقات کا زیادہ بہتر طور پر استعمال ہوتا رہا ہے قرآن میں متعدد آیات میں ان دونوں اوقات میں ذکر کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، **وذکر اسم ربک بکرۃ واصیلا** (اور اپنے رب کا نام کا ذکر کرو صبح اور شام)

چپ رہنے کی مشق کرتے رہنے کی ضرورت

•اس زمانہ میں لوگ بدلنے کی تو مشق کرتے ہیں جب کہ حضرت عمر□ حضرت علی □ اور حضرت ابوذر □ کا ارشاد ہے کہ جیسے بولنا سیکھنا ہے، اسی طرح چپ رہنا بھی سیکھنا ہے، خاموش رہنے کی جبراً مشق کرتے رہنا ناگزیر ہے، ورنہ زبان فرد کے لئے وبال بن جاتی ہے۔ (زبان سے روزمرہ زندگی میں جو گناہ ہوتے ہیں، اگر ان کا شمار کیا جائے تو وہ نیکیوں سے زیادہ ہوتے ہیں، زبان کی شہ زوری پر قابو پانا سخت مشکل ہے، اس کے لئے زبان کو لگام دینے کی مستقلاً مشق کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ یہ زبان جہنم میں داخلہ کا ذریعہ بن سکتی ہے)۔

کسی کو حقارت سے دیکھنے کے نقصانات

•جو کسی کو حقارت کی نظر سے دیکھے گا، اللہ پاک کی نظر میں وہ اسی وقت حقیر ہو جائے گا۔ (کسی کو حقارت کی نظر سے دیکھنا، اپنی بڑائی اور اپنے صاحب فضیلت ہونے کی علامت ہے، جو کبیرہ گناہوں میں شامل ہے، ایسا فرد اللہ کی نظر میں حقیر ہوتا ہے۔ اپنی شخصیت کی

اصلیت سے آشنائی ہوتی ہے یعنی خودشناسی ہوتی ہے فرد کی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ سب سے زیادہ اپنے آپ ہی کو سیاہ کار سمجھنے لگتا ہے، اور اللہ کے عتاب سے لرزاں و ترساں رہنے لگتا ہے، دوسروں کو حقیر سمجھنے کے تصور سے بھی وہ ڈرنے لگتا ہے)۔

قدرت رکھنے کے باوجود معاف کرنا

• اللہ پاک کے قریب وہ لوگ ہیں، جو قدرت رکھنے کے باوجود عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں۔(دوسروں کے قصوروں کو معاف کرنا، صاحب عزیمت افراد کا کام ہے، ایسے افراد نوازے جاتے ہیں اور ان کے قصور معاف کر دیئے جاتے ہیں دوسروں کے قصور معاف کرنا بہت بڑی صفت ہے، جسے حاصل ہو جائے وہ سب سے خوش نصیب فرد ہے، جو بندوں کے قصور معاف کرتا ہے، اللہ ان کے قصوروں کو معاف کرتا ہے، یہ صفت اکابر اہل اللہ میں موجود رہی ہے کیونکہ اہل اللہ کا قول ہے صوفی کی جان و مال مباح ہے، یعنی لوگ اگر صوفی کے جان و مال کو نقصان پہنچاتے ہیں تو صوفی کا دل اتنا بڑا ہے کہ وہ نہ صرف انہیں معاف کرتے ہیں، بلکہ ان کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں)۔

دنیا کے حوالے سے
لمبی امیدوں والے کا حشر

• جس کی امیدیں (دنیا کے حوالے سے) لمبی ہوتی ہیں، اس کا انجام بُرا ہوتا ہے۔(دنیا کے حوالے سے طویل امیدیں رکھنا، یہ دراصل دنیا پر فریفتہ ہونے کی علامت ہے، دنیا پر فریفتہ افراد دنیا پر مرمٹتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کا انجام بُرا ہوتا ہے، حدیث شریف ہے کہ دنیا کے لئے اتنا کرو، جتنا دنیا میں رہنا ہے آخرت کے لئے اتنا کرو جتنا آخرت میں رہنا ہے۔

حقیقی دانا تو وہی شخص ہے، جو شب و روز ابدی زندگی کی تیاری کا سامان جمع کرنے کی کاوشوں میں لگا رہتا ہے، دنیا کے حوالے سے لمبی امیدوں سے دنیا تو کچھ نہ کچھ مل جاتی ہے، لیکن آخرت میں محرومی کے خطرات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، ایسی دنیا جو ضروریات سے زائد ہو اور جس دنیا سے مزید دنیا بنانے کی فکرمندی غالب ہو، دنیا کے حوالے سے، وسیع تفکرات

غالب ہوں، ایسی دنیا کس فائدہ کی، البتہ اتنی دنیا کے لئے کوشاں ہونا ناگزیر ہے، جس سے تنگ دستی نہ ہو اور بنیادی ضروریات پوری ہوں، زیادہ دنیا بھی نقصان دہ ہے تو دنیا کا ضروریات کے مطابق نہ ہونا بھی فرد میں محتاجی کی علامت پیدا کر دیتی ہے، اس لئے اعتدال کی علامت ضروری ہے، بلکہ بہتر علامت تو یہ ہے کہ فرد کے پاس اتنی دنیا ہو جس سے وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے ساتھ ساتھ مستحق افراد کی دل کھول کر مدد بھی کر سکے، ایسا فرد خوش نصیب کہا جائے گا)۔

مصائب پر صبر کرنا حوصلہ مند افراد کا کام ہے

• جو مصائب برداشت کرتا ہے، وہ پوشیدہ رازوں کو پالیتا ہے۔(مصائب پر صبر کرنا حوصلہ مند افراد کا کام ہے، اس کی وجہ سے بندہ نوازا جاتا ہے، مصائب میں بیماری، معاشی تنگی، حوادث وغیرہ سب شامل ہیں، ان مصائب کو اللہ سے مانگتے رہنے اور اس سے مزید قریب ہونے کا ذریعہ بنانا چاہئے، زندگی تکالیف، بیماریوں اور مصائب سے خالی نہیں ہوتی ہر فرد کو کوئی نہ کوئی بیماری ضرور لاحق ہوتی ہے، یہ بیماریاں جہاں گناہوں کی معافی کا ذریعہ بھی بن جاتی ہیں، وہاں آخرت میں ان تکالیف کا جو اجر ملے گا، اسے دیکھ کر بندہ کہے گا کہ کاش کہ اسے دنیا میں مصائب ہی سے سابقہ پیش آتا، تاکہ یہاں ان تکالیف کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے درجات مزید بلند ہوتے، اس طرح کی حدیث شریف موجود ہے)۔

توبہ سے گناہوں کا
نیکی میں بدل جانا

• توبہ کے بعد سارے گناہ نیکی بن جاتے ہیں، کیونکہ توبہ میں ندامت ہے جو مقصود ہے۔(توبہ دراصل نئی بہتر زندگی شروع کرنے کا عہد کرنے کا نام ہے، توبہ کے بعد اگر گناہوں سے ممکن حد تک بچنے کی کاوش ہو تو ایسی توبہ نہ صرف سارے گناہوں کی معافی کا

ذریعہ بن جاتی ہے، بلکہ اس سے گناہ نیکیوں میں بدل جاتے ہیں، اس سلسلے میں قرآن میں متعدد آیات موجود ہیں، جو اللہ کی شانِ رحیمی کا مظہر ہیں)۔

نفس کا سب سے بڑا دشمن ہونا

• ہمارا سب سے بڑا دشمن نفس ہے، کفار کی دشمنی محدود ہے جب کہ نفس کی دشمنی غیر محدود ہے۔ (نفس کی قوت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ عزازیل کو شیطان بنانے اور فرعون کو فرعون بتانے میں نفس ہی کا کردار تھا، نفس کی اس قوت کو تابع بنانے کے لئے سخت مجاہدوں کی ضرورت ہے)۔

مال و کرسی میں نشہ کا ہونا

• ملک و مال و کرسی میں نشہ ہے، اس کے ملتے ہی انسان بدل جاتا ہے۔ (دولت اور منصب میں ایسا نشہ ہے کہ فرد اپنی اصل حقیقت کو بھول جاتا ہے اور بڑے پن کے مرض میں مبتلا ہونے لگتا ہے اور حد سے تجاوز کرنے لگتا ہے، ایسے خوش نصیب افراد بہت کم ہوتے ہیں، جو ملک و مال اور منصب ملنے کے باوجود حد اعتدال پر قائم ہوں، نفس کی قوتیں جو فرد کی شخصیت میں عام طور پر موجود ہوتی ہیں، مال اور منصب سے ان قوتوں کو ابھرنے کا موقعہ ملتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ظاہری دینداری بے نتیجہ ہونے لگتی ہے، اور مال اور منصب فرد کو فرعونیت کی راہ پر گامزن کرنے لگتی ہے، اس لئے بندہ مؤمن کو مال اور منصب سے بچنے کے لئے کوشاں ہونا چاہئے، نفس کوشاں ہوتا ہے کہ بندہ کو زندگی کے ہر موڑ پر اللہ سے دور اور غافل کر دیا جائے، اگر فرد نفس سے چوکنا ہو کر، بداعمالی سے باز بھی آتا ہے تو نفس وسوسوں کی صورت میں حملہ آور ہوتا رہتا ہے، اور وسوسوں کے ذریعہ اسے دنیاداری کی لائین پر لگانے کے لئے کوشاں ہوتا ہے، نفس پرستی کی قوتوں کا مقابلہ تو کثرت ذکر اور صحبت اہل اللہ کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے۔ کثرت ذکر کے باوجود اگر مال آتا ہے تو اس مال کی آزمائش نہ ہونے کی صورت یہ ہے کہ ایک تو فرد سرمایہ داروں والی آسائش کی زندگی سے محفوظ ہو، دوسرے یہ

کہ مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے دل کی آمادگی موجود ہو، جہاں یہ دونوں صورتیں موجود ہوں گی، وہاں مال و منصب فتنہ نہ ہوگا، بلکہ انعام شمار ہوگا، لیکن عام طور پر ایسا نہیں ہوتا)۔

غیبت سے بچاؤ کی صورت

• اگر کوئی تمہارے سامنے کسی کی غیبت کر رہا ہو اور تم میں اسے روکنے کی قدرت نہ ہو تو کوئی اور بات شروع کر دیا کرو، اس کے پاس سے اٹھ جاؤ، اس کی دل شکنی کا ذرا خیال نہ کرو کیونکہ اس کی دل شکنی سے دین شکنی زیادہ ہے۔

(غیبت کی وبا عام ہے، زبان دوسروں کی بُرائیاں بیان کرنے سے رکنے کا نام نہیں لیتی، کوئی مجلس دوسروں کے عیبوں کے بیان کرنے سے خالی نہیں ہوتی، مذہبی لوگوں میں عیب جوئی کی بُرائی کچھ زیادہ ہی ہے، اس سے بچاؤ کی جو صورت بیان کی گئی، اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔)

توکل کا مفہوم۔ اسباب کو مؤثر نہ سمجھنا

• توکل یہ ہے کہ اسباب کو مؤثر نہ سمجھا جائے، نہ ان پر اعتماد کیا جائے، بلکہ اللہ پاک پر نظر رکھی جائے، اسباب کا استعمال توکل کے منافی نہیں ہے۔ (اسباب کو مؤثر نہ سمجھکر اللہ کی ذات پر اعتماد کرنا، حقیقی توکل یہی ہے، یہی توکل اللہ کی معیت کو اپنے ساتھ لاتا ہے، **وعلی اللہ فلیتوکل المؤمنین** توکل کی حالت میں اسباب کو اختیار کرنے کے باوجود دل اللہ کی طرف مبذول ہوتا ہے کہ کام بنانے والی ہستی وہی ہے، توکل کی حالت مستحکم ہونے سے پہلے بندے کو آزمائش کے مرحلوں سے گزار کر اسے مستحکم کیا جاتا ہے، اس کے بعد ہی اسباب کا رخ بندے کی طرف موڑ دیا جاتا ہے)۔

نماز حقیقی معنٰی میں نماز کیسے ہو؟

• نماز سے رنج دور ہوتا ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب کوئی فکر پیش آتی تھی تو آپ جلدی سے نماز میں مشغول ہو جاتے تھے۔ (نماز اگر خشوع خضوع سے ادا ہو، نماز سے طبعی

رغبت پیدا ہو جائے تو فرد کے سارے رنج و غم دور ہو جاتے ہیں اور وہ نئی توانائی سے بہرہ ور ہو جاتا ہے اور وہ لازوال حلاوت سے فیضیاب ہونے لگتا ہے، ذکر، تلاوت اور نماز یہ تین چیزیں ایسی ہیں، جو فرد کو دنیا کے اثرات سے دور کر کے، اللہ سے قریب تر کر دیتی ہیں، اخلاص کو سنوارنے کا ذریعہ بنتی ہیں، شخصیت میں حسنِ معنوی پیدا کر دیتی ہیں، اللہ سے راز و نیاز کا سبب بنتی ہیں اور آخرت کے حوالے سے حوصلے میں اضافہ کر دیتی ہیں۔

نماز حقیقی معنٰی میں نماز اس وقت بنتی ہے جب ذکر کا ملکہ پیدا ہونے لگتا ہے، ذکر کا ملکہ خیالات میں یکسوئی پیدا کرتا ہے، اس یکسوئی سے نماز میں حضوری کی طلب پیدا ہونے لگتی ہے۔

تلاوتِ قرآن سے عبرت و موعظت بھی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب ذکر کے نور سے اندر میں موجود کدورتیں اور داخلی باطل سے گلوخلاصی حاصل ہونے لگتی ہے۔

جب تک نماز اور تلاوت میں یہ طلب پیدا نہ ہو تب تک نماز اور تلاوت سے تعلق رسمی صورت میں قائم رکھنا ہے، البتہ ذکر پر زیادہ توجہ دینی ہے، تاکہ کثرت ذکر سے نماز و تلاوت سے حقیقی استفادہ کی صورت پیدا ہو سکے۔ کثرت ذکر کا ملکہ راسخ ہو جائے اور اس سے باطن میں موجود کثافتیں بڑی حد تک دور ہو جائیں تو اس کے بعد نماز اور تلاوت ہی اصل ذکر کی جگہ لے لیتی ہیں یعنی جو فوائد شروع میں ذکر سے حاصل ہوتے ہیں، آخر میں اس سے کہیں زیادہ فوائد نماز اور تلاوت سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے بزرگوں کے ہاں ترتیب یہی ہے، طالبوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ آخر میں ذکر کو مختصر کر کے قرآن کی تلاوت اور نماز کے ملکہ کو راسخ کریں، اب ان کی ساری ترقی اسی سے ہوگی۔)

بندوں کے حقوق کی تلفی

• حق العبد میں حق تعالیٰ کی حق تلفی بھی ہوتی ہے کیونکہ بندے کا وہ حق اللہ تعالیٰ ہی کا مقرر کردہ ہے۔ (بندوں کی حق تلفی ہوتی ہے تو یہ حق تلفی اللہ کی حق تلفی بھی ہوتی ہے، اس لئے کہ بندوں کے حقوق بھی اللہ ہی کے مقرر کردہ ہوتے ہیں، اس لئے بندوں کی حق تلفی

کے بعد بندوں سے معافی کے ساتھ ساتھ اللہ سے بھی معافی مانگتے رہنا ضروری ہے، جن بندوں کی حق تلفی ہوئی ہے، اگر وہ انتقال کر گئے ہیں تو ان کے حق میں مستقلاً دعا کرتے رہنا چاہئے، ان شاء اللہ دعا کی برکت سے بندوں کے حقوق کی معافی کی صورت پیدا ہو سکتی ہے، اللہ رحیم ذات ہے، وہ بندوں کے دل میں معافی کا جذبہ ڈال دے گا)۔

صاحبِ اخلاص فرد کا خوشبو کو بکھیرتے رہنا

• اخلاص شہرت کا سبب ہے۔ (اخلاص میں تاثیر ہوتی ہے، صاحب اخلاص فرد خوشبو بکھیرتا رہتا ہے، صاحب اخلاص فرد دلوں کو دستک دیتا رہتا ہے اور زبان حال سے اللہ کے لئے زندگی گزارنے کی تلقین کرتا رہتا ہے، اس کی یہ تلقین بہت سارے وعظ و نصیحت پر بھاری ہوتی ہے۔ سبب یہ ہے کہ اس کا دل نور ایمان سے جگمگاتا ہے)۔

تلاوتِ قرآن کی اہمیت

• اگر قلوب نجاست سے پاک ہو جائیں تو کلام پاک کی تلاوت اور تدبر سے کبھی بھی طبیعت سیر نہ ہو۔ (جب دلوں میں موجود سیاہی دور ہو جاتی ہے، دل پاکیزہ ہونے لگتا ہے تو قرآن کی تلاوت سے طبعی رغبت پیدا ہونے لگتی ہے، اور قرآن کی تلاوت کے وقت یوں محسوس ہوتا ہے، گویا اس کے دل پر قرآن کا نزول ہو رہا ہے اور تلاوت سے سیر ہی نہیں ہوتی، قرآن کی تلاوت سے آخرت کی زندگی کا نقشہ ہر وقت سامنے آنے لگتا ہے اور ماضی کی زوال پذیر اور سزا یافتہ قوموں کے واقعات سے فرد کانپنے لگتا ہے، اللہ کے عتاب سے بچنے کی فکر اس پر غالب ہونے لگتی ہے، نیز دل دنیا سے سرد ہونے لگتا ہے، قرآن کی تلاوت کے یہ فوائد

ایسے ہیں جو کثرت ذکر کے ملکہ کے راسخ ہونے کے بعد حاصل ہوتے ہیں۔اس لئے کہا گیا ہے کہ قرآن کا اصل فائدہ اور حلاوت کثرت ذکر کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے)۔

آخرت کو دور سمجھنے کے نقصانات

• دور کے خطرے کا کم تاثر ہوتا ہے، آخرت کی فکر مندی کم ہونے کی وجہ بھی عمومی طور پر یہی ہے۔(آخرت کو ہم نے دور سمجھ لیا ہے، اس لئے آخرت کا خطرہ نہ ہونے کے برابر ہے، اور اس کی تیاری کی فکر مندی بھی نہیں ہے، حالانکہ آخرت بہت قریب ہے، **وما امر الساعة الا كلمح البصر او هو اقرب** وہ گھڑی واقع ہونے والی ہے آنکھ جھپکنے میں بلکہ اس سے بھی زیادہ قریب ہے، جو خوش نصیب افراد آخرت کو قریب سمجھتے ہیں، وہ آخرت میں اللہ کے سامنے جوابدہی کے احساس سے ہر وقت ترساں و لرزاں رہتے ہیں، جو آخرت کو دور سمجھتے ہیں صبح و شام دنیاوی جھنجھٹوں میں مشغول ہیں)۔

حق بات کو امت میں افتراق کا ذریعہ نہ بنانا

• جہاں حق بات کہنے سے امت میں تفرقہ وفساد پیدا ہو، وہاں حق بات کہنا جائز نہیں۔ (ایسی حق بات کہنا جس سے امت میں افتراق وانتشار پیدا ہو، اس سے احتیاط ضروری ہے، اس لئے کہ امت کا اتحاد اور اس کی وحدت افضل ہے، اہل اللہ کے ہاں اس بات کا خصوصی اہتمام رہا ہے کہ حق بات اس حکمت سے کہی جائے، جس سے امت میں افتراق پیدا نہ ہو اور دوسروں کے جذبات مجروح نہ ہوں)۔